چچا نہرو سے ننھے میاں، روٹھ گئے!
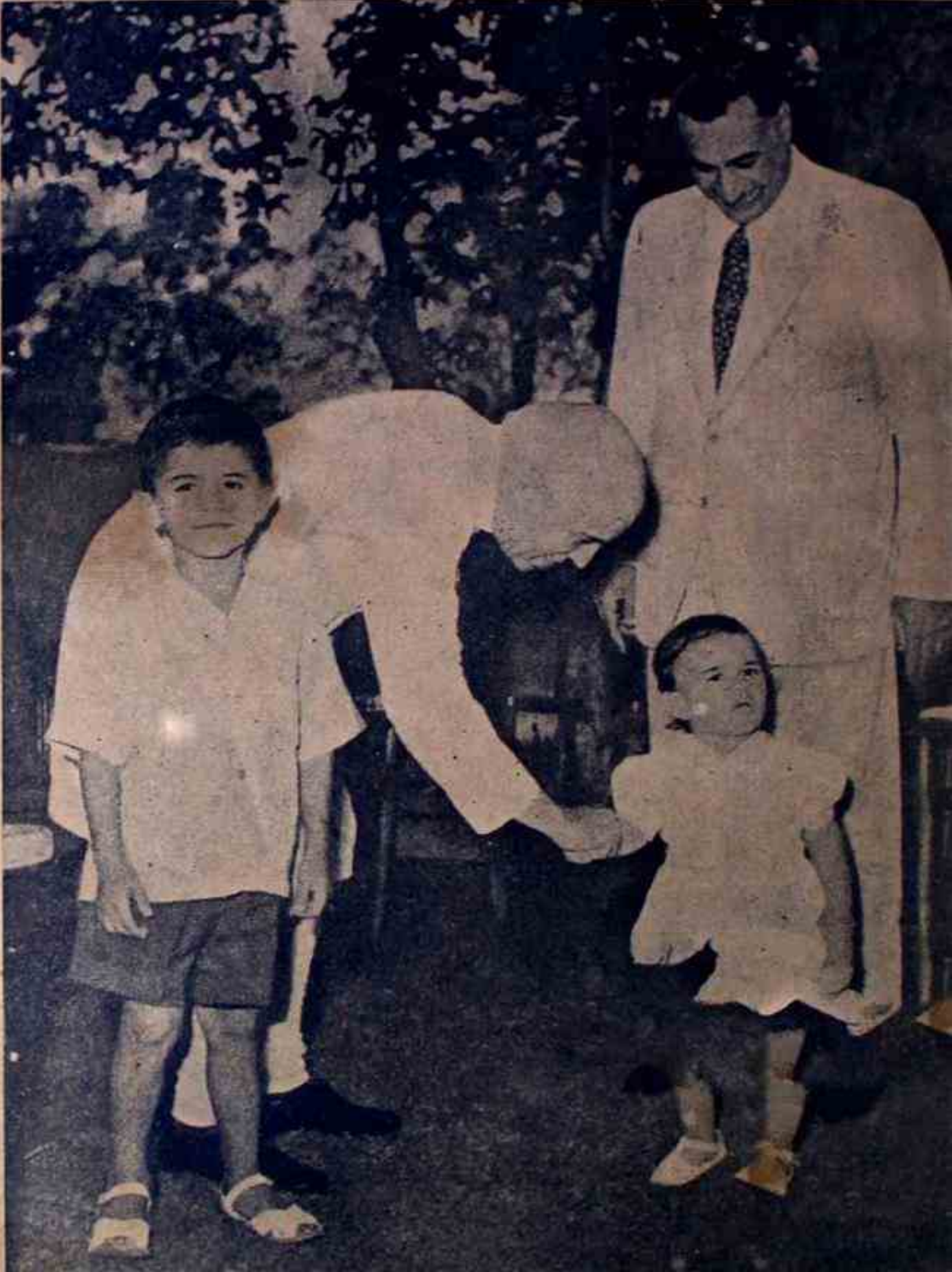
قیمت سالانہ: تین روپے
فی پرچہ: چار آنے
جلد (۲) نمبر (۲)

سوغات

پتہ: پوسٹ بکس ۶۳۲ نئی دہلی
اکتوبر سنہ ۱۹۵۶ء

اس شمارے میں

(شاہد خاں پرنٹر، پبلشر نے یونین پرنٹنگ پریس جامع مسجد دہلی میں چھپوا کر دفتر سوغات کناٹ پلیس نئی دہلی سے شائع کیا)

ناموسِ اسلام کی حفاظت کس طرح ہو؟

(ملیح آبادی)

بھارتیہ ودیا بھون (بمبئی) کی کتاب نے ایک دفعہ پھر نہ صرف مسلمانوں کو، بلکہ تمام نیک دل ہندوستانیوں کو بھی اس ضرورت کا قائل بنا دیا ہے کہ مذہبی پیشواؤں کی توہین کا سلسلہ سخت قوانین کے ذریعہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا جائے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ قانون کیسے ہی سخت اور ہمہ گیر بنائے جائیں، کیا توہین کا دروازہ بند کر سکتے ہیں؟ نہیں بند کر سکتے۔ کیوں؟

اس لئے کہ مثلاً ایک انصاف پسند اور تعصبات سے قطعی پاک غیر مسلم بھی اگر پیغمبر اسلام کی سوانح پاک لکھنے بیٹھے گا، تو لازمی طور پر واقعات مسلمانوں کی کتابوں ہی سے لے گا۔ سیرت کی کتابوں سے لے گا، تاریخ کی کتابوں سے لے گا، حدیث کی کتابوں سے لے گا، اور ان کتابوں کا حال یہ ہے کہ رطب و یابس، سچ اور جھوٹ سب کچھ ان میں بھرا پڑا ہے۔

ایک غیر مسلم سے آپ نہ اُمید کر سکتے ہیں نہ مطالبہ ہی کہ کتاب لکھنے سے پہلے علم حدیث کی تکمیل کرے اور اسماء الرجال کے فن کا امام بن جائے، جبکہ خود اکثر مسلمان عالم، حدیث اور اسماء الرجال سے قطعی جاہل ہیں۔

اب اگر غیر مسلم مصنف، ابن ہشام، ابن سعد اور کُتبِ حدیث کے حوالوں کے ساتھ واقعات قلم بند کرتا ہے اور ان واقعات سے توہین کے پہلو نکلتے ہیں، تو ہم اس مصنف کو کس طرح قصور وار ٹھہرا سکتے ہیں؟

مثلاً سیرت و حدیث کی کتابوں میں یہ روایت کثرت سے وارد ہوئی ہے اور مسلمانوں میں بھی مشہور و مقبول ہے کہ شروع شروع جب وحی نازل ہوئی، تو رسول صلعم خوف زدہ ہو گئے تھے کہ مبادا یہ چیز جن یا شیطان کی طرف سے نہ ہو، مگر حضرت خدیجہ نے اطمینان دلا دیا کہ یہ چیز، خدا کی طرف سے ہے۔ روایت لمبی ہے اور اس کا ترجمہ کرنا بھی نامناسب ہے، کیونکہ توہین آمیز ہے۔

غور تو کیجئے، اگر غیر مسلم، اسی روایت کو لے کر مقام نبوت کی عظمت کا اعتراف نہ کرے، تو کون اُسے ملامت کر سکتا ہے؟

اور یہ روایت تو کچھ بھی نہیں۔ حضرت زینب کے سلسلے کی روایتیں، سورۂ تحریم کی شانِ نزول سے متعلق روایتیں تو اور بھی بھیانک ہیں اور انتہائی توہین آمیز۔ اسی قدر نہیں، سورۂ نجم کے سلسلے میں یہ روایت مشہور ہے کہ حضرت رسول نے یہ سورۂ کریمہ حرم کعبہ میں تلاوت کی اور جب اس آیت پر پہنچے "أَفَرَأَيْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزَّىٰ، وَمَنَاةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرَىٰ" تو مشرکین کو خوش کرنے کے لئے یہ لفظ بھی فرما گئے "تلك الغرانيق العلىٰ، وإن شفاعتهن لترتجىٰ" یعنی بتوں کی تعریف کی اور اعلان کر دیا کہ بتوں کی سفارش و شفاعت خدا کے ہاں مقبول ہے! روایت میں یہ بھی مذکور ہے کہ یہ الفاظ، شیطان نے حضرتؐ کے قلبِ اطہر پر طاری کر دیئے تھے!

ذرا انصاف کیجئے، اگر اس روایت کو غیر مسلم مصنف درج کرے اور اس سے یہ نتیجہ نکالے کہ معاذ اللہ حضرت نے مقام نبوت ترک کر دیا تھا، تو آپ ایسے مصنف پر کس حق سے مقدمہ چلا سکتے ہیں؟ وہ ضرور کہے گا، اور عدالت کو ماننا پڑے گا کہ میں نے اپنے دل سے کچھ نہیں لکھا، مسلمانوں ہی کی حدیث و سیرت کی کتابوں سے لکھا ہے!

تو اب سوچنا یہ ہے کہ جب ہماری کتابوں کا یہ حال ہے تو ہمیں کرنا کیا چاہئے؟ کوئی قانون بھی کارگر نہیں ہو سکتا جب تک ہماری کتابوں میں یہ روایتیں موجود ہیں اور خود ہمارے بہت سے علماء بھی انہیں صحیح سمجھ رہے ہیں۔

کچھ مدت پہلے "سوغات" میں لکھا گیا تھا کہ احادیث پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ بھارت ودیا بھون کی کتاب نے اس ضرورت کو بڑی شدت سے ثابت کر دیا ہے اور دیکھنا ہے کہ اب مسلمان اور ان کے علماء کیا کرتے ہیں؟

اس ضرورت کے مقابلے میں ایک ہی بات عمل میں آسکتی ہے۔ اُن تمام روایتوں کو کتاب سے نکال دیا جائے، جو اسلام اور پیغمبر اسلام کی عظمت و شان کے خلاف ہیں، کیونکہ اس قسم کی تمام روایتیں موضوع اور جھوٹی ہیں۔

سب جانتے ہیں کہ علم حدیث ایک مرتب علم ہے اور روایات

کے پرکھنے کے اصول مقرر ہو چکے ہیں، اسماء الرجال کے امام راویوں کے حالات بڑی جانفشانی سے جمع کر چکے ہیں اور یہ بھی بتا گئے ہیں کہ کس راوی کی روایت معتبر ہے اور کون راوی ضعیف یا جھوٹا ہے۔ اس طرح ہر حدیث کی نسبت ہم آسانی سے معلوم کر سکتے ہیں کہ روایت کے لحاظ سے اس کا درجہ کیا ہے۔

پھر درایت کے لحاظ سے بھی روایات کی پرکھ آسان ہے۔ اصولِ حدیث میں طے پا چکا ہے کہ ہر وہ روایت باطل ہے، جو دین کے مسلمات کے خلاف ہے، عقلِ سلیم کے خلاف ہے۔ عام انسانی مشاہدے کے خلاف ہے۔ قوانینِ فطرت کے خلاف ہے۔

قابلِ اعتراض تمام روایتیں یا تو اپنے راویوں کی وجہ سے باطل ہیں، یا اصولِ درایت کے لحاظ سے ناقابلِ قبول ہیں، اور جب واقعہ یہی ہے تو اس قسم کی روایتوں کو کتابوں میں باقی رکھنے کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ ناواقف لوگ — نیک نیت ہونے پر بھی — دھوکے میں پڑیں اور روز روز ہم اسلام اور پیغمبرِ اسلام کی توہین ہوتے دیکھا کریں۔

لیکن یہ کام — روایتوں کے پرکھنے اور چھانٹنے کا کام — ہما شما کے کرنے کا کام نہیں ہے۔ یہ کام جیّد علمائے اسلام ہی کر سکتے ہیں۔ عملی صورت یہ ہے کہ جمعیۃ علماء ہند اس اہم ترین دینی ضرورت کو محسوس کرے اور دنیا بھر کی اسلامی حکومتوں سے درخواست کرے کہ وہ مستند علماء کی ایک کمیٹی بنائیں! اور یہ کمیٹی اس کام کو انجام دے۔ کمیٹی صحیح حدیثوں کو غلط روایتوں سے الگ کر دے اور اسلامی حکومتیں اپنے خرچ سے صحیح کتابیں شائع کر دیں۔ غلط روایتیں ایک الگ کتاب میں جمع کر دی جائیں اور کتاب پر صاف لفظوں میں لکھ دیا جائے کہ یہ روایتیں اسلام میں مقبول نہیں۔

اس کارروائی کے بعد بے شک توہینِ اسلام کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جائے گا۔ اس پر بھی اگر کسی بدنفس نے جھوٹی روایتوں کو اچھالا، تو قانون اس کی سرکوبی کر دے گا۔

مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی بھی چل بسے

(ملیح آبادی)

مرنا تو سبھی کو ہے، لیکن سچ سچ سوتے جاگتے بھی یہ خطرہ نہیں گزرا تھا کہ مولانا حبیب الرحمان ہم سے جُدا ہو جائیں گے اور ہم بدنصیب اُن کے ماتم کے لئے باقی رہ جائیں گے۔

•

مولانا مرحوم و مغفور ہمارے جہادِ آزادی کے اولین رنگروٹ اولین سپاہی ہی نہیں تھے بلکہ جہادِ آزادی کے ایک جلیل القدر سپہ سالار بھی تھے۔ مرحوم جوان تھے کہ جنگِ آزادی کا بگل بجا اور وہ مردانہ وار میدان کارزار میں کود پڑے۔ بیسویں صدی کے فرعونِ اعظم برطانیہ کا مقابلہ تھا۔ بڑے بڑے سورماؤں کا پتا، برطانیا کا نام سنتے ہی پانی ہو جاتا تھا، مگر یہ مردِ مجاہد مسکراتا ہوا رن میں آ گیا، انتہائی مصائب، ناقابلِ بیان کڑیاں جھیلیں، لیکن جیتون کبھی میلی نہ ہونے پائی۔

راہِ حق میں بڑی بڑی منزلیں طے ہو گئیں، وہ منزلیں طے ہو گئیں، جن سے اولیاء، شہداء، صدیقین، انبیاء کو گزرنا پڑا تھا۔ موسیٰ کو طور پر ایک جلوہ نظر آیا تھا، یوسفؑ کو قید خانے میں کوئی تجلی ملی تھی، یعقوبؑ کو آنسوؤں میں ڈوبنا پڑا تھا۔ ایوبؑ نے درد و الم کی تلخیاں چکھی تھیں۔ اللہ تعالیٰ کا کرم دیکھو کہ لدھیانے کے ایک نحیف و زار بندے کو راہِ حق میں یہ سب درجے مل گئے۔ عزمِ موسیٰ ملا، حزمِ یوسف ملا، نالۂ یعقوب ملا، اور صبرِ ایوب سے شادکام ہوا!

کیسا خوش تھا یہ نحیف و زار بندہ، کیسی خوش نصیب تھی وہ خاک جس سے یہ بھاگوان بندہ اُٹھا تھا، اور کیسے خوش نصیب ہیں ہم بدبخت لوگ بھی، جنھیں اس بندے کی زیارت ہی نہیں، رفاقت اور دوستی کا امتیاز بھی حاصل ہوا!

عزمِ صمیم کا ایک پہاڑ تھا، جو ڈھ گیا! ہمت و جرأت کا ایک آتش فشاں تھا، جو ٹھنڈا پڑ گیا! حق و صداقت کا ایک صور تھا، جو ہمیشہ کے لئے چُپ کر دیا گیا! اخلاص و شرافت کا ایک پیکر تھا، جسے موت کے ہاتھ نے ہمیشہ کے لئے مٹا دیا!

لیکن وہ کون ہے، جو کہہ سکے کہ مولانا حبیب الرحمان مر گئے ہیں؛ حبیب الرحمان، مرنے کے لئے پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ وہ جینے کے لئے پیدا ہوا تھا اور رہتی دنیا تک جیتا ہی رہے گا۔

حبیب الرحمان کا جسم تو بے شک لاغر تھا، مگر حبیب الرحمان کے لاغر و ناتوان جسم میں وہ روح تھی، جو باطل قوتوں کے مقابلے میں پہاڑوں سے بڑھ کر اٹل اور باڑھ دار تلواروں سے زیادہ کاٹ والی تھی۔ عجیب ایمانی جوش تھا، حیرت انگیز اسلامی جذبہ تھا۔ راہِ حق میں اُس زبان سے شعلے برستے تھے، اور خطابت اس پر نثار ہوتی تھی۔

جلیل القدر، عظیم الشان ہونے پر بھی فروتنی و خاکساری کا مجسمہ تھا، ایسا

شخص تھا جو شاید اپنے بلند مقام اور عظیم مرتبے سے بالکل بے خبر تھا۔ اللہ کی رحمتیں ہوں حبیب الرحمان پر، سچ مچ مردِ مسلمان تھا۔ غریبوں کے آگے بچھا ہوا، مگر باطل کا ٹکرانے والا!

افسوس، ہمارے نیکوکار چلے جا رہے ہیں، اور اُن کی جگہیں پُر کرنے والے ملتے نہیں۔ اب اللہ ہی جانے اس اُمت کا حشر کیا ہونے والا ہے؟

بڑی مشکل ہے کہ ایسے بزرگوں پر لکھتے ہوئے کچھ نہ کچھ خود اپنا تعلق بھی مجھ گنہگار کو جتانے کی مجبوری درپیش ہے۔ یہ تو مولانا مرحوم کی محض خاکساری اور رواداری تھی کہ اس عاجز کو کبھی بھی اپنی محبت کی گرمیوں سے محروم نہ ہونے دیا۔ ارادہ تھا کہ مرحوم پر تفصیل سے لکھا جائے، مگر ایسی مصروفیتوں کا شکار ہوں کہ ارادہ پورا نہ کر سکا، لیکن ارادہ سے دستبردار نہیں ہوا ہوں۔ انشاء اللہ پہلی ہی فرصت میں یہ فرض انجام دوں گا۔

لیکن مرحوم کی پاک روح سے اس گنہگار کو ایک شکوہ بھی ہے۔ آہ، دل کی نگاہیں دیکھ رہی ہیں کہ مرحوم اپنی زندگی کی تمام بشاشتوں اور دلربائیوں کے ساتھ بالکل آمنے سامنے جیسے ہم کلام ہیں ——— "کیوں مولانا! وہ آپ کا وعدہ کیا ہوا کہ اس حقیر سے پہلے سفر نہیں ہوگا؟" ——— مسکرا رہے ہیں! ضرور بڑے، بہت ہی بڑے، انعام و اکرام سے سرفراز ہو چکے ہیں! مبارک ہو۔ مگر اب بھائی کم سے کم یہ تو کرو کہ ہم بھی بچھڑے نہ رہیں، اور یقین کرو ——— حالانکہ تمہیں یقین ہے ——— کہ اپنی تمہاری راہ سے ان شاء اللہ ہم بھی ہٹنے والے نہیں ہیں! وَمِنْهُمْ مَنْ قَضَىٰ نَحْبَهُ وَمِنْهُمْ مَنْ يَنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيلًا! (راہ حق کے کچھ مسافر دنیا سے سدھار چکے اور کچھ اپنے کوچ کی راہ تک رہے ہیں، لیکن اُنھوں نے اپنی کچھ روش میں کچھ بھی تبدیلی ہونے نہیں دی ہے!)

سلامتی ہو مرد مجاہد مولانا حبیب الرحمٰن پر

آمین!

حضرت جمیل مظہری کی "فریاد"

ملیح آبادی

حضرت جمیل مظہری کو میں نوجوان شاعر سمجھتا ہوں، حالانکہ وہ اپنے آپ کو نوجوان نہیں سمجھتے۔ اس شاعر کو میں نے کلکتہ میں جب پہلی دفعہ دیکھا تھا تو بالکل نوجوان تھا اور میں زندگی بھر جمیل مظہری کو نوجوان ہی سمجھتا رہوں گا،

لیکن شاعری میں یہ نوجوان شاعر ایسا ہے کہ میرا جیسا غیر شاعر بھی اس کا معتقد ہے۔ حضرت جوش ملیح آبادی اس زمانے میں کسی شاعر کے قائل ہیں تو جمیل مظہری کے، اگر دونوں شاعر ہیں اور آپس میں نپٹ لیں، میں وہ ہوں جسے شاعری کی ہوا بھی نہیں لگی، لیکن میرا جیسا کندۂ ناتراش بھی اگر کسی شاعر کے کلام پر سر دھننے لگے، تو میرے خیال میں شاعر کے لئے یہ جوش ملیح آبادی سے بھی بڑا سارٹی فیکٹ ہوگا۔ خدا کا شکر ہے، بھینس نہیں ہوں۔ شاعر نہ سہی، مگر "کچھ نہ کچھ" شعر سمجھ لیتا ہوں۔

حضرت مظہری کو مجھ سے اور مجھے اُن سے جو ناقابل بیان محبت ہے، اُسی کا تقاضا تھا کہ انھوں نے اپنی "فریاد" عطا فرما دی۔ کس منہ سے شکریہ ادا کروں، لیکن شکریے کی ضرورت بھی کیا ہے؟

"فریاد" کا پایہ اردو ادب میں کیا ہے؟ اس وقت فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ "فریاد" پڑھی جائے گی۔ برابر پڑھی جائے گی اور ایک مدت کے بعد نقاد بتلا سکیں گے کہ "فریاد" نے اردو ادب پر کیسے انمول رتن نچھاور کر دیئے ہیں۔ ۴

۴ "فریاد" آج بھی ہزاروں دلوں اور زبانوں پر ہے گی اور صدیوں آتی رہے گی۔ "شکوہ" کا دامن تنگ ہو گیا۔ "فریاد" کے دامن میں ساری دنیا سما گئی ہے۔ "سوغات" کو فخر ہے کہ "فریاد" کو پیش کرنے کی عزت حاصل ہو رہی ہے۔

مولانا نورالدین بہاری مرحوم

ملیح آبادی

دیکھا، ایک اور یار اُٹھ گیا۔ "یارانِ طریقت" میں یہ یار دبنگ تھا۔ آزادی کی راہ میں اِس مرحوم نے وہ سب مصائب برداشت کیں ——— مسکرا کے، ہنستے ہنستے برداشت کر لیں، جن کے تصور سے بھی بڑے بڑوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ انگریز سے ٹکرایا اور ٹکراتا ہی رہا ——— یہاں تک کہ انگریز اس کے وطن سے بھاگ گیا۔

مولانا نورالدین اچھے مقرر تھے۔ سچے وطن پرور تھے۔ صحیح الدماغ تھے۔ روشن خیال تھے۔ علمائے کرام کی محفلوں کی رونق تھے۔ جمعیۃ علماء ہند کے سرگرم رکن تھے، مگر عام مولویوں سے الگ ہی تھے۔ بہت الگ تھے۔

سچ تو یہ ہے کہ مولانا مرحوم اپنی وضع کے ایک ہی تھے اور ایسے تھے کہ اب ان کی جگہ بھرنے والا کوئی دکھائی نہیں دیتا۔ یہ واقعہ ہے کہ آدمی جب تک جیتا رہتا ہے، اس کی خوبیوں پر غور کرنے کا لوگوں کو موقع نہیں ملتا، لیکن جب موت کے ہاتھوں ہم سے بچھڑ جاتا ہے تو ایک ایک کر کے اس کی خوبیاں آنکھوں کے سامنے تنے لگتی ہیں، اور ہم کفِ افسوس ملتے رہ جاتے ہیں کہ کاش مرحوم کی زندگی میں اُس کی فضیلتوں کو جانتے اور فائدہ اُٹھاتے۔

رحمتیں ہوں مردِ مجاہد نورالدین پر! واقعی دین کا نور تھا۔ ان شاء اللہ ہم بھی جلد ملنے والے ہیں تم سے اے ہمارے رفیق قدیم!

ساڑھے چار ہزار سال پہلے کے ایک بادشاہ کی خود نوشت سوانح عمری

مسیح آبادی

عراق' بہت پرانا ملک ہے. حضرت مسیح کی پیدائش پر ساڑھے انیس سو سال سے زیادہ گزر چکے ہیں' اور دنیا نہ جانے کہاں سے کہاں ترقی کرتی ہوئی پہنچ چکی ہے' مگر ہماری ترقی یافتہ دنیا' اپنے ماضی سے کیسے غافل رہ سکتی ہے؟ حال کا زمانہ تو ماضی ہی کا نتیجہ ہوتا ہے. اسی لئے عراق میں کھدائی سے پرانے زمانے کی جو چیزیں برآمد ہوئی ہیں' ہماری موجودہ دنیا اُن سے پوری پوری دلچسپی لے رہی ہے.

ان پرانی چیزوں میں بھی سب سے زیادہ قیمتی چیز وہ نوشتے ہیں جو پُرانے زمانوں میں مٹی کی تختیوں پر لکھے گئے تھے اور ان تختیوں کو پکا کر محفوظ کر لیا گیا تھا. خوش قسمتی سے یہ نوشتے برآمد ہو گئے ہیں. انہی نوشتوں میں سے ایک نوشتے' یا کتاب کا خلاصہ "سوغات" کے سالنامے میں آپ "عشتار" دیوی کے قصے میں دیکھ چکے ہیں. لیکن ایک اور قدیم نوشتہ بھی ہے' جس کا ترجمہ پیش کرنے پر دل بُری طرح مچلا ہوا ہے.

یہ نوشتہ اصل میں عراق کے ایک بادشاہ کی سوانح عمری ہے' جو بادشاہ نے خود لکھی ہے. مختصر ہے. بہت ہی مختصر' مگر ننھی سی سوانح عمری ہونے پر دین و مذہب کی موجودہ دنیا میں زلزلہ ڈال سکتی ہے.

یہ نوشتہ' شاہ سرجون کی سوانح عمری ہے. سرجون بادشاہ حضرت مسیح کی پیدائش سے دو ہزار چار سو برس پہلے دُنیا میں سانس لے رہا تھا یعنی سرجون کے زمانے پر اب ۴۳۵۶ سال گزر چکے ہیں یعنی یہ سرجون بادشاہ' حضرت موسیٰ سے بھی صدیوں پہلے گزر چکا ہے' اور سری کرشن جی سے بھی' لیکن اس بادشاہ نے اپنی پیدائش اور ابتدائی زندگی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے' بعینہٖ وہی بات ہمیں حضرت موسیٰ اور سری کرشن کی سوانح عمریوں میں ملتی ہے.

یہ تو کھلی بات ہے کہ شاہ عراق' سرجون نے اپنی سوانح عمری کے لئے کچھ بھی حضرت موسیٰ اور سری کرشن کے قصوں سے نہیں چرایا' کیونکہ یہ بادشاہ' ان دونوں بزرگوں سے صدیوں پہلے گزر چکا ہے.

تو پھر کیا یہ کہا جائے کہ حضرت موسیٰ اور سری کرشن کے قصے' اسی سرجون بادشاہ کی سوانح عمری کی مدد سے بنائے گئے ہیں؟ اس سوال کا جواب' اہل علم ہی دے سکتے ہیں. "سوغات" کے دائرے سے یہ بحث باہر ہے.

* * * *

بہرحال اب سرجون' شاہ عراق کی خود نوشت سوانح عمری سُن ہی لیجئے.

سرجون' وہ پہلا بادشاہ ہے' جس نے عراق کی طوائف الملوکی اپنی طاقت سے ختم کر دی' اور بہت سی سلطنتوں کو مٹا کر' اور ان مٹی ہوئی سلطنتوں کو ملا کر پورے عراق میں ایک زبردست سلطنت قائم کر دی.

لیکن قدیم نوشتوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرجون کسی بادشاہ کا بیٹا نہیں تھا اس پر بھی وہ پورے عراق کا بادشاہ بن گیا. سرجون کو قدیم عراقیوں کے اس عقیدے سے اپنی سلطنت قائم کرنے میں بڑی مدد ملی کہ بادشاہی انسانوں کی کوشش سے حاصل نہیں ہوتی' بلکہ دیوتاؤں کی بخشش ہوتی ہے. دیوتا جس کسی پر بھی مہربان ہو جائیں' وہی بادشاہ ہو جاتا ہے.

سرجون کی یہ سوانح عمری بھی اسی بات سے شروع ہوتی ہے کہ دیوی عشتار کو سرجون سے محبت ہو گئی تھی اور عشتار ہی نے سرجون کو بادشاہی کے لئے چُن لیا تھا.

اب سنئے' یہ سرجون بادشاہ اپنی سوانح حیات کس طرح لکھتا ہے:

"میں' سرجون ہوں' جلیل القدر بادشاہ — "اکد" کا بادشاہ'

"میری ماں' کنگال تھی' اور میں اپنے باپ کو جانتا ہی نہیں کہ وہ کون تھا!

"لیکن مجھے یہ معلوم ہے کہ میرے باپ کے بھائیوں کو پہاڑوں کی زندگی پسند تھی'

(باقی دیکھئے صفحہ ۹ پر)

اعتقادی باللہ

اشہد ان لا الٰہ الا اللہ

سرسید احمد خاں (مرحوم)

میں نہایت سچے دل سے اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ تمام عالموں کا بنانے والا کوئی ہے اور اُسی کو ہم کہتے ہیں "اللہ" وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا اس کا ہونا ضروری ہے، اس کا نہ ہونا ممکن نہیں۔ وہ سب سے بڑا ہے اور تمام صفاتِ کمال اس کی ذات میں موجود ہیں، اس کا ساکوئی نہیں، ہونے میں کیونکہ ہونا اس کی ذات ہے۔ اور نہ اس کا ساکوئی کسی صفت میں کیونکہ اس کی تمام صفتیں ہی اُس کی ذات ہے۔ وہ زندہ ہے نہ جان سے بلکہ اپنی ذات سے، وہ دیکھتا ہے نہ کسی دیکھنے والی چیز سے بلکہ اپنی ذات سے۔ وہ سنتا ہے نہ کسی سننے والی چیز سے بلکہ اپنی ذات سے۔ وہ بولتا ہے نہ کسی بولنے والی چیز سے بلکہ اپنی ذات سے۔ وہ تمام نقصانوں سے پاک ہے۔ اور تمام عیبوں سے بے عیب۔ یہ مثل کہ بے عیب ذات خدا کی ہے بالکل اس پر ٹھیک ہے۔ تمام مخلوقات کا وہی خالق ہے۔ تمام معلومات کا وہی عالم ہے۔ سب ممکن چیزوں پر قادر ہے۔ الحی القائم ہے۔ دانا و بینا ہے نہ اس کا کوئی ..... مشابہ ہے نہ اس کا کوئی مصاحب اور مددگار اور نہ اس کی مانند کوئی ہے اور نہ اس کا کوئی شریک نہ وجوب وجود میں اور نہ استحقاق عبادت میں۔ اور نہ پیدا کرنے میں اور نہ صلاح و تدبیر بنانے میں پس اُس کے سوا کوئی کسی قسم کی عبادت یعنی اظہار اپنے تذلل اور اس کی غایت الغایت تعظیم کا مستحق نہیں ہے، پس ہمارے تذلل کا اور جو طریقہ اُس کی تعظیم کا ٹھہرایا گیا ہو، اس طریقہ کی تعظیم کا استحقاق اس کے سوا کسی دوسرے کو نہیں۔

وہی بیمار کو اچھا کرتا ہے اور وہی سب کو رزق پہنچاتا ہے۔ وہی بلائیں کو ٹالتا ہے اور وہی خوشیوں کو لاتا ہے مگر یہ سب باتیں قانون قدرت کے مطابق کرتا ہو۔

اُس کا قانون قدرت کبھی ٹوٹتا نہیں وہ ہر طرح کے قانون قدرت کے بنانے پر قادر ہے مگر جو قانون قدرت اُس نے بنا دیا ہے پھر اس کے برخلاف کچھ ہوتا نہیں۔

قدرت کے قانون بنانے میں کسی سبب کا محتاج نہیں۔ بدیع السمٰوات والارض وا ذا قضیٰ امراً فانما یقول لہ کن فیکون۔

امر کے لفظ سے وہی قانون قدرت مراد ہے جس کو بغیر کسی سبب کے صرف کُن کے لفظ سے یعنی ارادہ سے جو مقتضائے کمال ہے بنا دیا ہے۔

وہ کسی میں سماتا نہیں نہ کسی میں ملتا ہے اس میں تعدد و حدوث آ ہی نہیں سکتا نہ اس کی ذات میں اور نہ اس کی صفات میں۔ اس کا تعلق متعلقات سے بھی حادث نہیں ہے بلکہ ظہور متعلقات سے ان کے وقتوں میں وہم حدوث اور خیال تعدد ہوتا ہے۔ مگر اُس میں نہ حدوث ہے نہ کسی طرح کا تعدد۔

وہ نہ جوہر ہے نہ عرض ہے نہ جسم ہے نہ کسی محدود جگہ میں ہے نہ کسی خاص جگہ میں ہے نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہاں ہے وہاں ہے۔ نہ اُس میں حرکت ہے اور نہ اُس پر سکون کا اطلاق ہو سکتا ہے اور نہ اُس کی نسبت کسی جگہ سے آنا اور کسی جگہ میں جانا بولا جا سکتا ہے۔ اُس کے لئے کوئی طرف، سمت مقرر نہیں۔ اینما تولوا فثم وجہ اللہ۔ اُس کا عرش پر ہونا صرف انسانوں کو اس کی بڑائی کا خیال دلاتا ہے نہ اُس کا عرش پر یا اوپر کی سمت پر ہونا۔ اوپر تو ایک اضافی سمت ہے جو ہماری اوپر کی سمت ہے وہ کسی دوسروں کی نیچے کی سمت ہے۔ مگر عرش پر ہونے سے ہر ایک کے دل پر وحشی سے لے کر مہذب فلسفی تک کے دل پر اس کی بڑائی کا خیال آتا ہے۔

مرنے کے بعد مومنین و موحدین اس کو دیکھیں گے۔ وہ ایک ایسا روحانی انکشاف ہوگا جو عقل تصدیق سے جیسے کہ اس دنیا میں ہم دیکھتے ہیں بدرجہا بڑھ کر ہوگا جس کی نسبت عرف عام میں آنکھوں سے دیکھنا کہا جاتا ہے

مگر اس رویت کے لئے نہ سمت ہوگی نہ بصر، نہ صورت ہوگی نہ شکل، نہ رنگ ہوگا نہ کوئی ڈھنگ۔ نہ مقابلہ ہوگا نہ آمنا سامنا، محض "ہو" کا مقام ہوگا۔

کفر و معاصی کا بھی اسی قانون قدرت کے موافق وہی خالق ہے مگر اس نے اپنے قانونِ قدرت سے انسان کو ایسا بنایا ہے جس میں اس سے بچنے کی قدرت رکھی ہے اس لئے اگرچہ خدا ان کا خالق ہے مگر انسان خود اپنی قدرت و اختیار سے ان کا کاسب ہے۔ مگر اس کو نہ کفر و معاصی سے کوئی نقصان ہے نہ عبادت کی حاجت۔

اس کے تمام کام سراسر حکمت ہیں، جو کچھ کہ اس سے ہو وہ سب نیک ہے۔ کما قیل۔ آنچہ از پردۂ خفا بمنصۂ ظہور جلوہ گر است ہمہ نیکو است ؎

پیر ما گفت خطا در قلم صنع نرفت
آفریں بر نظر پاک خطا پوشش باد

پس جور و ظلم کی نسبت اس کی طرف نہیں ہو سکتی۔ وہ اپنی مخلوق کو پیدا کرتا ہے جس طرح کہ اس کی حکمت کا اقتضا ہوتا ہے۔ عدل و حکمت کے لئے ہر ایک کو اسی کے حال میں دیکھنا چاہیئے نہ کہ نسبتاً۔ کیونکہ عدل و حکمت نسبتی چیز نہیں ہے بلکہ ہر ایک کے لئے بمنزلہ اس کے خاصہ کے ہے جس کی تعریف میں آیا ہے ما یوجد فیہ ولا یوجد فی غیرہ

اس کے سوا کوئی حاکم نہیں۔ مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اندھا دھند خودی سے لغو و بے فائدہ احکام جاری کرنے لگے۔ پس یہ اعتقاد رکھنا کہ حسن و قبح اشیاءٗ کی اور کسی فعل پر ثواب یا عقاب ہونا صرف خدا کے حکم اور اس کے امر و نہی کے سبب سے ہے محض لغو اعتقاد ہے بلکہ حسن و قبح اشیاء کی اور کسی فعل پر ثواب و عقاب کا ہونا اسی قانونِ قدرت پر مبنی ہے اور خدا کے احکام اسی قانونِ قدرت کا بیان ہیں پس ان میں سے بعض تو ایسے ہیں کہ ان کے حسن و قبح کو ابتداءً ہی عقل انسان کی دریافت کر لیتی ہے۔ اور بعض ایسے ہیں بعد الاخبار من الرسل من اللہ تعالیٰ ان کے حسن و قبح کو عقل تسلیم کرتی ہے۔

ساڑھے چار ہزار سال پہلے کے.......

بقیہ مضمون صفحہ ۷

"میرا وطن شہر "ازو فیرانو" ہے جو دریائے فرات کے کنارے آباد ہے"

میں اپنی قیرباں کے پیٹ میں کسی نہ کسی طرح آگیا اور میری ماں نے مجھے ایک خفیہ جگہ جنم دیا"

"پھر میری ماں نے جننے کے بعد "بردی" کے تنکوں سے بنائی ہوئی ٹوکری میں مجھے لٹا دیا اور ٹوکری کو بند کر کے اس کے ڈھکنے پر مہر لگا دی۔

"میری ماں نے مجھے دریا میں ڈال دیا، مگر دریا کی موجوں نے مجھے غرق نہیں کیا"

"دریا کی موجوں نے مجھے اپنے بازوؤں پر اٹھا لیا" اور "اکی" تک پہنچا دیا جو کھیتوں کو سیراب کرنے والا بہشتی تھا۔

"بہشتی نے جب دریا میں اپنا ڈول ڈالا تو میں ڈول میں آگیا۔

"اکی بہشتی نے مجھے اپنا بیٹا بنا لیا" اور اپنے سگے بیٹے ہی کی طرح پالا پوسا"

"اکی بہشتی نے مجھے کسان بنا کے اپنے باغ میں کام کرنے کے لئے چھوڑ دیا"

"لیکن جب میں اکی بہشتی کے باغ کا باغبان تھا، تو عشتار دیوی نے مجھ سے محبت کی گرہ جوڑی۔

"پھر میں بادشاہ ہو گیا اور میں نے تمام "سیاہ سر والوں" کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

"اور میں نے سر بفلک پہاڑوں کی چوٹیاں اپنے قدموں سے روند ڈالیں"

"اور اپنے برونزی (مخلوط دھات) گرزوں سے پہاڑوں کے ٹکڑے اڑا دیئے۔

"میں آسمان سے باتیں کرتے پہاڑوں پر فخریہ چڑھ گیا"

"اور نیچے پہاڑوں کو کچل کے رکھ دیا۔

"اور سمندر کے ساحلوں تک میں جا پہنچا۔

"اور میں نے شہر "دلمون" کو مسخر کیا۔

"اور عظیم شہر "دیر" کو سر کر لیا۔

"تو اب دیکھنا ہے، کون جانشین بنتا ہے، مجھ اولوالعزم فاتح کا؟

"اور میرے جانشین کو بھی میری ہی طرح سورما، جرار، عظیم الشان ہونا چاہیئے"

(باقی عبارت مٹ گئی ہے)

فریاد

اپنے مرشدِ فن علامہ اقبال کو ایک سجدۂ عقیدت کے ساتھ

(از حضرت جمیل مظہری)

(۱)

عشق اور عقل میں پھر جنگ کا ساماں ہے آج — کہ عقائد سے جنوں دست و گریباں ہے آج
خاکِ افسردہ میں پھر شورشِ طوفاں ہے آج — ذہنِ تشکیک کا شیرازہ پریشاں ہے آج
دلِ شاعر میں سوالوں کے حباب اُٹھتے ہیں — آندھیاں تیز ہیں ذراتِ سراب اُٹھتے ہیں

(۲)

کس سے پوچھوں کہ یہ ہنگامۂ ہستی کیا ہے — یہ فسوں کیا ہے جنوں کیا ہے یہ مستی کیا ہے
برق یا ابر کی ہر چرخ پہ ہستی کیا ہے — جب بلندی کی یہ فطرت ہے تو پستی کیا ہے
چہرۂ نور پہ یہ پردۂ ظلمت کیوں ہے — یہ اُجالے کو اندھیرے کی ضرورت کیوں ہے

(۳)

نطق حیراں ہے کہ یہ عالمِ آواز ہے کیا — جنبشِ مضطربِ سلسلۂ راز ہے کیا
عقل کیا جانے بھلا سوز ہے کیا ساز ہے کیا — عشق خود سر بہ گریباں ہے کہ یہ ناز ہے کیا
یہ تپش ہے کہ کشش ہے یہ تماشا کیا ہے — جب تمنا نہیں کوئی تو تقاضا کیا ہے

(۴)

برق و خرمن میں محبت بھی نظر آتی ہے — بیچ میں اُن کے عداوت بھی نظر آتی ہے
نور کے بھیس میں ظلمت بھی نظر آتی ہے — حسن میں عشق کی سیرت بھی نظر آتی ہے
سوز میں ساز کہ تمکیں میں اشارہ دیکھے — شوق مضطر ہے کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھے

(۵)

آنکھیں مجبورِ تماشا ہیں نظارے مجبور — بحرِ افلاک کے تاریک کنارے مجبور
کشتیاں وقت کی مجبور ہیں دھارے مجبور — کبھی جھپکی نہ پلک یوں ہیں ستارے مجبور
سلسلے قید کے ہیں ارض و سما کچھ بھی نہیں — دو جہاں جبرِ مشیت کے سوا کچھ بھی نہیں

(۶)

حسرت اے خالقِ نیرنگ تماشائے مجاز — یہ تجلی ہے کہ پردہ یہ تبسم ہے کہ راز
جس طرف جائیے اک مرحلۂ دور و دراز — جس طرف دیکھئے اک معرکۂ ناز و نیاز
ذرّے سمٹے ہوئے بیٹھے ہیں بیاباں کیا ہے — ذرہ ذرے سے گریزاں ہے یہ طوفاں کیا ہے

(۷)

تیری اس بزم میں کس کو ہے دماغِ محفل — پُر ہو جب خونِ تمنا سے ایاغِ محفل
جس کو دیکھو سو ہے دلسوز فراغِ محفل — بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل
جو بھی اس بزم میں آیا سو پریشاں نکلا — تیر بھی سینۂ بسمل سے پُر افشاں نکلا

(۸)

تیرے گلزارِ جراحت کی ہوا بھی مجروح — سسکیاں کہتی ہیں یہ بادِ صبا بھی مجروح
نگہِ شوق کی چوٹوں سے حیا بھی مجروح — کوئی دیکھے تو ہے قاتل کی ادا بھی مجروح
کس کو معلوم یہاں کس کی خودی بسمل ہے — کشتۂ ناز کہ بسمل کی چھری بسمل ہے

(۹)

ذرہ صحرا میں نہ شامل ہو تو وہ غمگیں ہو   موج کے واسطے ساحل ہو تو وہ غمگیں ہو

موش اگر لقمۂ قاتل ہو تو وہ غمگیں ہو   لقمہ گربے کو نہ حاصل ہو تو وہ غمگیں ہو

کون غمگیں نہیں تیرے عزاخانے میں   خونِ حسرت کی ہے سرخی اس افسانے میں

(۱۰)

قطرہ دریا میں نہ گم ہو تو ہو شی کی غذا   تنکے گلشن میں جُھلسیں تو ہوں آندھی کی غذا

تھا یہ انصاف کہ طاقت ہو ضعیفی کی غذا   تیری دنیا میں مگر گھاس ہے بکری کی غذا

اور بکری کا لہو شیر کی طاقت کو بہ   کتنا بے رحم ہے قانونِ طبیعت توبہ

(۱۱)

ساز بدلا کرے کروٹ تو تکلم پائے   کھائے مضراب کی ٹھوکر تو ترنم پائے

غنچہ اپنے لئے امید بقا گر پائے   سو جگر چاک کرے ایک تبسم پائے

موجیں ساحل سے پٹکتی ہی رہیں سر اپنا   تو نہ بدلے کسی حالت میں بھی تیور اپنا

(۱۲)

چشمِ شاعر میں ہے یہ تیرا گلستاں نظری   بو ہو یا رنگ ہو دونوں ہی یہاں ہیں سفری

ہر کلی باغ کی بلبل کا ہے زخمِ جگری   بھرتی پھرتی ہے دمِ سرد نسیمِ سحری

ابر میں اس کے جو رحمت کا نشاں تھا اکثر   یہ بھی گیتی کے کلیجے سے دھواں اٹھتا ہے

(۱۳)

محشرستانِ تمنا ہے یہ تیری محفل   حالتِ رقص میں ہے موجِ غبارِ ساحل

گردِ صحرائے طلب تا بہ سوادِ منزل   ذرے ذرے میں لئے ایک دھڑکتا ہوا دل

کب سے دنیا کو سناتی ہے کہانی اپنی   کہہ رہی ہے ترا افسانہ زبانی اپنی

(۱۴)

اور وہ انساں کہ جو تخلیق کا تیری شہکار   متحیر، متفکر، متردد، ناچار

کشتۂ احساس یہ صدیوں کا رلایا آیا   تہ میں جذبات کی بے چین عناصر کا فشار

رقت کی تیز مزاجی کا غبار آنکھوں میں   بادہ در خوشۂ انگور، خمار آنکھوں میں

(۱۵)

اپنی خواہش کا غلام اپنی طبیعت کا غلام   اپنی نفرت کا غلام اپنی محبت کا غلام

اپنے مذہب کا غلام اپنی سیاست کا غلام   کبھی فطرت سے مبارز کبھی فطرت کا غلام

حوصلا اتنی غلامی پہ بھی آزادی کا   صید بربستہ مگر شوق بھی صیادی کا

(۱۶)

برتری کی تپشِ شعلہ گداز ایک طرف   بندگی کی ہوسِ تیرہ طراز ایک طرف

دل کا سوز ایک طرف وقت کا سانس مختصر   ارتقا کا سفرِ دور و دراز ایک طرف

اور یہ بھی نہیں معلوم کدھر جاتا ہے   دل اُدھر ہے تو خرد بھی جدھر جاتا ہے

(۱۷)

جبکہ قابو میں نہیں اُس کے عناصر کا فتور   اُس سے منسوب ہو کیوں اُس کی طبیعت کا قصور

گرچہ ادراک سے خالی تو نہیں جیبِ شعور   مگر اے کاش مشیت کا یہ دستور ہو دور

اپنے شوق اپنی نگاہوں پہ تو قادر ہوتا   اپنی مرضی سے گناہوں پہ تو قادر ہوتا

(۱۸)

لوگ کہتے ہیں ترا عکس ہے یہ نقشِ وجود   تو اکیلا تھا تری بجھ گئی میرے معبود

تیری دنیا میں تو ہیں تجھ سے کروڑوں موجود   پھر یہ کیوں بحث نہ ہو کون ہو کس کا مسجود

شکوہ بے وجہ ہے سازوں میں جو آہنگ نہ ہو   جب تقاضے متصادم ہوں تو کیوں جنگ نہ ہو

(۱۹)

اس کو ایسا جو بنایا تو بنانا ہی نہ تھا   شوقِ پرواز کا مٹی کو دلانا ہی نہ تھا

خاک میں فتنۂ احساس جگانا ہی نہ تھا   کیا عناصر کا خدائی میں ٹھکانا ہی نہ تھا

جو بنانا پڑا یہ خاک کا پُتلا تجھکو   عالمِ شوق میں سوجھا نہ نتیجا تجھکو

(۲۰)

قیدِ احساس کی یہ سلسلہ بندی کیسی؟   خوئے تخلیق کی افسانہ پسندی کیسی؟

جبکہ پستی میں اُتارا تو بلندی کیسی   شرطِ انصاف ہے یہ حوصلہ مندی کیسی

جن کا کچھ جرم نہیں ان کو ستانا کیسا   مشتِ ذرات کو جرم دے کے رُلانا کیسا

(۲۱)

خاک میں آگ کی فطرت کو سمونا کیسا　　نور کو سینۂ ظلمات میں بونا کیسا
شعلۂ تند کو شبنم سے بھگونا کیسا　　یہ نہ ہونے کے برابر ہوا ہونا کیسا
ایسی مخلوط بناوٹ کا نتیجہ بھی تو دیکھ　　آب و آتش کی ملاوٹ کا نتیجہ بھی تو دیکھ

(۲۲)

کارخانہ ہے خدائی کا اسی سے ابتر　　شر میں ہے خیر تو ہے خیر میں آمیزشِ شر
حد تو یہ ہے کہ محبت ہوئی فتنہ اکثر　　جس میں رہتی نہیں مطلق ترے بندوں کی خبر
ایسا رجحانِ عبادت مرے داور کیا ہے　　تو اسے خیر سمجھتا ہے تو پھر شر کیا ہے

(۲۳)

عافیت جبکہ تمدن سرِ میداں بیچے　　کیوں نہ پھر جنسِ خودی بندۂ دکاں بیچے
بھوکے بچوں کے لئے لاج اگر ماں بیچے　　باپ چوری کا گنہگار ہو ایماں بیچے
تو پھر اس کے لئے حکمِ حرم و دیر ہے کیا　　شر اگر اس کو کہا جائے تو پھر خیر ہی کیا

(۲۴)

تو نے سمجھا کبھی اس عصمتِ عورت کا درد　　جس کو بازار میں عصمت کے نہ پوچھے کوئی مرد
یعنی جب حسن کے چہرہ پہ ہو افلاس کی گرد　　زندگی اس کی نہ کیوں ہو مسلسل دمِ سرد
ہائے وہ وقت کہ جب غیرتِ انساں بکے　　آ کے بازار میں بیچے بھی تو ایماں نہ بکے

(۲۵)

اے سبب سببِ رنج و بلا بھی تو ہے　　درد کو ہے یہ شکایت کہ دوا بھی تو ہے
یہ تو ظاہر ہے کہ ربِ امرا بھی تو ہے　　کیا یہ سچ ہے کہ غریبوں کا خدا بھی تو ہے
تو ہے منعم تو یہ تعلیمِ توکل کیوں ہے　　تو ہے رزاق تو پھر بھوک کا غل کیوں ہے

(۲۶)

سُن تو آتی ہیں یہ ماتم کی صدائیں کیسی　　سسکیوں سے ہیں یہ لبریز فضائیں کیسی
تری دنیا میں یہ آہوں کی گھٹائیں کیسی　　بھیگی بھیگی ہوئی اشکوں سے ردائیں کیسی
کبھی کبھی جو سوئے عرش ہوا جاتی ہے　　کیا یتیموں کے بلکنے کی صدا جاتی ہے

(۲۷)

تو نے انسان کی خاطر تو بنا لی دنیا　　چین سے اس نے گھڑی بھر نہ سنبھالی دنیا
جس پہ قربان ہو شاعر کی خیالی دنیا　　اس کے خوابوں نے بنا لی وہ مثالی دنیا
مگر اک خواب بھی کمبخت کا پورا نہ ہوا　　ہے مکمل تو تری چیز ادھورا نہ ہوا

(۲۸)

ہے تمدن کا جو رجحانِ عمل بازاری　　درِ دولت پہ جو ہے فکر و نظر کی خواری
یہ جو احساس پہ ہے موت کی حالت طاری　　یہ جو انصاف کی ہر سمت ہے ماتم داری
یہ جو ہنگامے ہیں سرمایہ و مزدوری کے　　سب کرشمے ہیں یہ انسان کی مجبوری کے

(۲۹)

وہ جو مجبور نہ ہوتا تو نہ ایسا ہوتا　　کہ جہاں جمع ہوں پیسے وہیں دریا ہوتا
یعنی پیمانہ ضرورت کا جو پورا ہوتا　　حرص ہوتی نہ یہ تقسیم پہ جھگڑا ہوتا
نہ تسابق نہ تصادم نہ فضیلت ہوتی　　دین ہوتا نہ یہ قانون کی لعنت ہوتی

(۳۰)

یہ بھی کیا جبر ہے مالک تری قدرت کے نثار　　کہ جو شعلوں سے ڈرے ہو وہ جہنم بکنار
پھینکنا چاہے تو کچھ اور بڑھے بیڑے کا بار　　باہمہ شدتِ احساس یہاں تک ناچار
کہ نتیجہ بھی سمجھ لے تو عمل کر نہ سکے　　حسبِ فرمانِ خرد جی نہ سکے مر نہ سکے

(۳۱)

یہ تو سچ ہے کہ عزیزِ دو سرا بن نہ سکا　　جانشیں محفلِ امکاں میں ترا بن نہ سکا
ساقیِ میکدۂ ارض و سما بن نہ سکا　　یعنی تھوڑی سی خودی دی تھی خدا بن نہ سکا
حیرت اس پہ ہے کہ اپنا بھی نہ ہو کر رہ سکے　　آبِ گل کے بھی تقاضوں کو ادا کر نہ سکے

(۳۲)

پھر بھی اس جبر پہ جاری ہی رہی تگ و دو　　کانپتی بھی رہی جلتی بھی رہی شمع کی لو
ہر قدم اس کا اُٹھایا گیا رستے سو سو　　ہر تھکن اس کی بناتی رہی اک منزلِ نو
جس جگہ بیٹھ گیا تھک کے وہ میخانہ بنی　　نیند آنکھوں میں جو آئی بھی تو افسانہ بنی

(۳۳)

تیرے صحرا کو چمن آ کے بنایا اُس نے دھوپ تھی تیز تو پیدا کیا سایہ اُس نے
عالمِ خواب میں فطرت تھی جگایا اُس نے ذرّے ذرّے کو لہو اپنا پلایا اُس نے
کہیں ماتھے کا پسینہ کہیں آنسو جھڑ کے روح جوانی نچوڑے ہوئی خوشبو جھڑ کے

(۳۴)

سبقِ مدرسۂ لیل و نہارا ایک طرف نازبرداریٔ لیلائے بہار ایک طرف
عرصۂ جہد میں دردِ گل و خار ایک طرف رنگ و بو ایک طرف گرد و غبار ایک طرف
عمر تھوڑی سی ہے کمبخت کی اور کام اتنے بسکہ اک صید ہے اور چار طرف دام اتنے

(۳۵)

دستِ قسمت میں دیا تو نے گریباں اس کا پھر بھی تیرا ہی تشکّر رہا ایماں اس کا
کیا ہے نعمت سے اگر بھر دیا داماں اس کا تیرا احساں جو وہ مانے تو ہے احساں اس کا
اس میں کھانا ہو کہ پینا ہو کہ آرام اپنا کام تیرا ہے سمجھتا ہے جسے کام اپنا

(۳۶)

بسکہ اس بندۂ مجبور کی قسمت ہے جہاد اس کی نفرت ہے جہاد اس کی محبت ہے جہاد
علم و اخلاق کی تحصیل سعادت ہے جہاد پیٹ کے واسطے دن بھر کی مشقت ہی جہاد
ذہنِ افسردہ کو ہوتی ہے سہارے کی تلاش ناؤ ہو سست تو کیونکر نہ ہو دھارے کی تلاش

(۳۷)

زلف کی چھاؤں میں گرتا ہے جو تھک کر آرام تو سلاتی ہے تھپک کر اسے موسیقیٔ شام
گنگناتی ہوئی پازیب کا آہنگِ کلام یہ دہکتے ہوئے ساغر یہ چھلکتے ہوئے جام
لیکن ہیں اک سببِ تشنگیٔ خام اس کے لئے جائے عبرت ہے کہ یہ بھی ہوں حرام اس کے لئے

(۳۸)

کیوں شکن شعلۂ بربط و مینا نہ کرے درد پھر درد ہے کیوں فکر مداوا نہ کرے
زخم کیوں خنکیٔ مرہم کو گوارا نہ کرے یہ نئی بات کہ بیمار کراہا نہ کرے
پرسشِ اس جرم کی کیا روزِ جزا بھی ہوگی ایسے مجبور کی سنتے ہیں سزا بھی ہوگی

(۳۹)

یہ تو اس وقت بگڑتا ہے کہ جب ہوش نہ ہو طائرِ عقل کا سایہ بھی سرِ دوش نہ ہو
اور اس وقت جب انجام فراموش نہ ہو یعنی طوفانِ عناصر کا تھمے جوش نہ ہو
تو عناصر کا یہ شیرازہ بکھر جائے غریب ہوش اصلاح کا جب آئے تو مر جائے غریب

(۴۰)

جو ہو اسرار کا جویا وہ بیاباں چھانے فلسفہ موت کا کیا ہے اسے تو ہی جانے
آ نکلیں منزلِ مقصود پہ جب دیوانے تو چھلک جائیں ہیں عمر کے بھی پیمانے
کیوں نہ جلتی رہے ہر شمع سحر ہونے تک کیوں پتنگے نہ جئیں رقصِ شرر ہونے تک

(۴۱)

تو نے آئینۂ قلبِ عرفاں بھی توڑا! تو نے پیمانۂ صبرِ رفقا بھی توڑا!
تو نے کنبے کی امیدوں کا دیا بھی توڑا تو نے بوڑھوں کی ضعیفی کا عصا بھی توڑا
تو نے ماؤں کے کھلونے بھی بہت توڑ دیئے اس پہ یہ ظلم کہ ٹوٹے ہوئے دل جوڑ دیئے

(۴۲)

دیر تک کوکھ جلی ماں کو بھی رونے نہ دیا زخمِ پژمردہ کو اشکوں سے بھگونے نہ دیا
دل کو بوجھ اپنی تمنّایات کا ڈھونے نہ دیا جان تھی اپنی امانت اسے کھونے نہ دیا
چھین لی روح سے جذباتِ وفا کی پونجی دے دیا صبر مگر لے لی وفا کی پونجی

(۴۳)

الغرض موت تو ہے گردنِ تخلیق کا ہار سبھی مجبورِ اطاعت ہیں سبھی ہیں ناچار
ہاں مگر تیری خدائی میں وہی ہیں مختار خونِ انصاف سے رنگین ہے جن کی تلوار
جو گلا گھونٹتے ہیں فرض کے دیوانوں کا جن کے دامن پہ لہو ہے ترے ارمانوں کا

(۴۴)

جس میں احساس نہ ہو اپنی صدا پر قادر جس میں جذبات نہ ہوں حرفِ دعا پر قادر
ایسی دنیا میں خودی اپنی غذا پر قادر ظلم تخریب پہ اور حرص جفا پر قادر
اہلِ تعمیر کے ہاتھ اور نہ جذبے آزاد اہلِ تخریب کے سفاک ارادے آزاد

(۴۵)

کیوں نہ دھندلی ہو جائیں تری آیاتِ جلیل — اُن پہ جو فضل ترا جن کے مزاحم ہوں ذلیل

اُن پہ رحمت نہ ہو جو ہوں تری رحمت کی دلیل — کیا یہ شایاں ہے ترے عدل کے اے ربِ جلیل

ذہن تشکیک کی گرہوں کی ذرا کھول کے دیکھ — دلِ شاعر کی ترازو پہ اسے تول کے دیکھ

(۴۶)

یوں تو ہوتی رہی انصاف کی شورا شوری — نہ گئی ظلم کے ہاتھوں سے خرد کی ڈوری

اس کے سو بھیس ہیں کہتے ہیں جسے سب چوری — خوں سے کمزور کے چلتی ہے یہاں شہ زوری

موت جب جرمِ ضعیفی کی سزا ہو یارب — کیوں نہ شاعر تری سنت سے خفا ہو یارب

(۴۷)

ایسے اندھے کہ جو توہینِ شبِ ماہ کریں — ایسے بندے کہ جو تاریخ کو گمراہ کریں

پردۂ خدمتِ دیں میں ہوسِ جاہ کریں — خون بندوں کا پئیں نصرتِ اللہ کریں

ایسے لوگوں پہ بھی ہوتی رہی شفقت تیری — سچ ہے غالب ترے قہر پہ رحمت تیری

(۴۸)

چیرہ دستوں کو ملے جو وہ تجمل بھی غلط — ان کی تادیب میں رحمت کا تامل بھی غلط

نازبردارِ مشیت سے تجاہل بھی غلط — وہ تجمل بھی غلط اور یہ تغافل بھی غلط

نگراں بر رحمت چشمِ غضب را چہ علاج — شیوۂ پرورشِ غیر سبب را چہ علاج

(۴۹)

جن سے پہنچے ترے ناموسِ علم الت کو گزند — ان کا پرچم بھی بلند ان کا ستارہ بھی بلند

اور جو حق کے منادی ہوئے زنداں میں ہیں بند — بات سیدھی ہے لگا ہے بلائے رنجند

حق و باطل میں بہرحال جدائی نہ ہوئی — یہ تو شاہی ہوئی سرکار خدائی نہ ہوئی

(۵۰)

جذبۂ منفعلِ آدم و حوا کی قسم — تیشِ مستقلِ سینۂ یحییٰ کی قسم

یونس و نوح و خلیل و زکریا کی قسم — نانک و گوتم و زرتشت و مسیحا کی قسم

قسم ان کی جو چلے دل کے اشارے کے خلاف — قسم اُن کی جو تڑے وقت کے دھارے کے خلاف

(۵۱)

زہدِ سلماں کی قسم فقرِ ابوذر کی قسم — پیرِ جیلاں کی قسم مرشدِ سنجر کی قسم

خوں سے بھیگے ہوئے عمامۂ حیدر کی قسم — ریشِ آلودۂ خونِ علی اصغر کی قسم

قسم ان کی جو نہ سمجھے تری قدرت کا مزاج — قسم اُن کی جو بدلتے رہے فطرت کا مزاج

(۵۲)

کاکلِ خم بہ خمِ ساحرِ بنگالہ کی قسم — بارشِ یم بہ یمِ رحمتِ بطحا کی قسم

سوزِ موسیٰ و فسونِ لبِ عیسیٰ کی قسم — اور قسمیں یہ سبک ہوں تو یہودا کی قسم

وسعتِ حوصلۂ شمرِ ستمگر کی قسم — شدتِ عزمِ ہلاکو و سکندر کی قسم

(۵۳)

اہلِ تخریب پہ ہوگا جو یونہی پیار ترا — مسخ ہو جائے گا کچھ اور بھی شہکار ترا

مرثیہ پڑھنے لگی امتِ احرار ترا — حالتِ نزع میں ہے عالمِ بیمار ترا

تجربہ یہ بھی اگر ختم ہو ناکامی پر — اس کا الزام ہو فطرت کی غلط گامی پر

(۵۴)

میں یہ کہتا نہیں عقل اپنا گریباں نہ سیئے — میں یہ کہتا نہیں بدبخت تو ان نہ جیئے

عرض اتنی ہے کہ محنت کا پسینہ نہ پیئے — خونِ مزدور سے تہذیب جلائے نہ دیئے

اب تو لاشوں سے غریبوں کی مکاں اٹھتا ہے — دیکھ شاعر کے کلیجے سے دھواں اٹھتا ہے

(۵۵)

اب جو مظلوموں کی آہوں میں اثر دے یارب — اب تو حکام کو شاعر کا جگر دے یارب

چشمِ واعظ کو بصیرت کی نظر دے یارب — قلبِ منعم کو محبت کا شرر دے یارب

جن کے خالی ہیں دماغ ان کو خیالات بھی دے — جو ہیں افکار کے مالک انہیں جذبات بھی دے

(۵۶)

عشق اک قطرۂ ناچیز ہے دریا کر دے — کوہ کو کاہ بنا ذرہ کو صحرا کر دے

اک تبسم سے یہ دنیا تہ و بالا کر دے — دیر اتنی ہے کہ تو ایک اشارہ کر دے

پھر تو یہ وقت کی رفتار بدل جائے ابھی — لڑکھڑاتا ہوا انسان سنبھل جائے ابھی

(باقی صفحہ ۲۲ [illegible])

حقیقت کہاں ہے؟

ادارہ

قدیم یونان کے مرکز ایتھنز' فلسفہ کے گہوارے اور حکمت کے سرچشمے پر رات کی خاموشی چھا گئی تھی۔

رات نے اپنی سیاہ قنائیں تان دیں۔ محو خواب شہر کی لمبی سانسوں کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دیتی۔ اتنے میں چاند نکل آیا۔ روپہلی چاندنی کوہ و درخت پر چھا گئی۔ مندروں کی سنہری بُرجیاں چمک اٹھیں۔ زیتون اور خرمے کے درخت بے ساختہ کھلکھلا اٹھے۔

شہروں کی ملکہ ایتھنز سو رہی ہے۔ دروازوں پر چوکیدار اونگھ رہے ہیں لیکن صرف ایک نوجوان ہے جو اب تک جاگ رہا ہے!

دیوکلس! حُسن' ذہانت' دولت کے خزانوں کا مالک ہے۔ اکاڈمی میں حکمت کا طالب علم ہے' اپنا پورا دن اور رات کے بھی بہت سے گھنٹے علم و حکمت کے پہلو میں گزارتا ہے۔ صحبت اور معاشرت سے بیزار ہے۔

ایک بوڑھے حکیم کی طرح پورا خلوت پسند ہے۔ تفکرات کے سمندر میں شب و روز غواصی بس یہی اس کا شغل ہے۔

ایتھنز یعنی حکمت کی دیوی کا مرمری خوبصورت بت اکاڈمی کے صحن میں نصب تھا دیوکلس سب طالب علموں سے زیادہ حکمت کے اس خاموش مجسمہ کے پاس جاتا اور ہمیشہ اس کے تصوّر میں غرق رہتا۔ اُس کی دلی مناجاتوں کا مرکز بھی تھا۔ اُس کے دماغ کے استغراق کا مرکز بھی یہی تھا۔ وہ اس کی دلفریب صورت پر غور کرتا۔ وہ اس کے جمال معنی وحقیقت کی جستجو میں محو ہو جاتا۔ وہ اس سے حکمت کی وحی اور علم کا پیام زبانی طلب کرتا۔ وہ حکمت کی جستجو میں حکمت کے مجسمہ کا عاشق تھا۔

× × ×

آج رات دیوکلس' پھر دیوی کے سامنے دست بستہ کھڑا ہے۔ رات ڈھل گئی مگر وہ بے حس وحرکت کھڑا ہے۔ اچانک اس نے سر اٹھایا اور بُت کے قدموں پر گر پڑا۔ بوسوں پر بوسے لئے۔ آنسوؤں سے اُس کے پاؤں دھونے لگا

"اے علم و حکمت کے مظہر محبوب! رحم! رحم! مجھے ایک نظر دیکھ لے! ایک مرتبہ کے لئے میری التجائیں سن لے!"

وہ دیر تک آنکھوں کے آنسوؤں اور زبان کی دعاؤں سے مُنہ جاتا کرتا رہا۔ پھر اس نے نظر اٹھائی۔ چاند نے اپنی شعاعیں جمع کر کے دیوی کے چہرے کی رعنائی بے حساب کر دی تھی۔

ہوا چلتے چلتے رک گئی' پتوں کا شور تھم گیا۔ پہلے سے زیادہ سکون طاری ہو گیا۔

نوجوان کا دل تنگ ہوا۔ اس نے لمبی آہ بھری۔ اور آہ کے ساتھ ہی آنسوؤں کی لمبی لڑیاں رخساروں پر پھیل گئیں۔

"مقدس دیوی!" دیوکلس نے جوش سے چلا کر کہا "تیرے ہی قدموں پر میرا سر دھرا ہے۔ تیری ہی عبادت پر میری روح جھکی ہے۔ تو نے میرے دل کو حکمت کے عشق سے معمور کر دیا۔ تو نے حقیقت کی جستجو کی آگ لگا دی ہے آگ اب جلائے ڈالتی ہے۔ یا تو ہمیشہ کے لئے اسے ٹھنڈا کر دے' یا حقیقت کا جمال پنہاں ایک بار دکھا دے۔ ہاں حقیقت' مقدس عظیم حقیقت۔ اس ہیبت کائنات کی حقیقت۔ اس ہولناک ازلیت و ابدیت کی حقیقت' ہر وجود کی روح مجرد حقیقت' عُریاں حقیقت' وہ حقیقت جس کی جستجو میں تمام فلاسفر سرگرداں رہے اور حکیموں کو بستر خواب پر کبھی نیند نہ آئی حکمت کی پاک دیوی.... حقیقت کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے بے نقاب کر دے میں اُسے جاننا اور دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں اُسے سارے پردوں اور نقابوں کے اندر دیکھنا چاہتا ہوں میں اُس کی پرستش پر دل بد چکا ہوں' میں اُس کی راہ میں اپنی زندگی اور زندگی کی تمام مسرتیں اپنی دولت' عزت' حسن' شباب' محبت سب کچھ قربان کر دوں گا!"

دیوکلس نے یہ کہا اور گردن اٹھا کر دیوی کا منہ دیکھا۔ وہ بدستور خاموش اور بے حس وحرکت تھی۔ نوجوان نے اپنی پیشانی پھر اُس کے مرمریں

قدموں پر رکھ دی اور گڑگڑانے لگا۔ اُس کی روح، اُس کی آنکھیں، اُس کی زبان تینوں دیوی کے قدموں پر تھے۔ روح آتشِ شوق سے جل رہی تھی، آنکھیں گریۂ عشق میں بہہ رہی تھیں۔ زبان دعا و مناجات سے وارفتہ تھی!

× × × ×

اچانک درختوں کے پتے ہلے، ڈالیوں میں جنبش ہوئی، نسیم کے جھونکے چلے۔ ہوا میں ایک آواز گونجی! "دیوکلس!" "دیوکلس!"

نوجوان چونک اُٹھا۔ اِدھر اُدھر گھبراہٹ سے دیکھنے لگا۔ سمجھا، اُسے اُس کے ہم مدرسہ پکار رہے ہیں، مگر وہاں کوئی انسان بھی نظر نہ آیا۔

"دیوکلس!" "دیوکلس!" نوجوان تمنائی نے نگاہ اٹھا کر بُت کو دیکھا کیا دیکھتا ہے کہ سچ مچ اُس کے ہونٹ ہل رہے ہیں!...... اچانک سنگِ مرمر کے ہاتھ میں جنبش ہوئی........ دیوی نے اپنا ہاتھ دیوکلس کے کندھے پر رکھ دیا........ بجلی کی ایک طاقتور لہر اُس کے بدن میں دوڑ گئی۔ خوف کی شدت سے اُس کے حواس معطل ہوگئے........

لیکن آواز اب تک آرہی تھی "دیوکلس!" "دیوکلس!"

"دیوکلس! تو نے مجھے پکارا۔ لے میں آگئی۔ تیری مناجات میں نے سُن لی۔ بول کیا مانگتا ہے؟"

دہشت سے نوجوان کی سانس رک گئی، بے اختیار زمین پر گر پڑا۔ قریب تھا بے ہوش ہوجائے۔ جب کچھ عرصے کے بعد اُس کے ہوش و حواس واپس آنے لگے، تو اُس نے خوف زدہ نظروں سے دیوی کو دیکھا:

"ہاں مقدس دیوی!" اُس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "میں ہی تیرے حضور آہ و زاری کر رہا تھا۔ مجھے "حقیقت" کی جستجو ہے میں حقیقت کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں اُسے بے نقاب دیکھنا چاہتا ہوں........"

"تو حقیقت کی کھوج میں ہے!" دیوی نے اپنی پُر رعب آواز میں کہا "حقیقت خود "ہی" "وجود" ہے۔ حقیقت کہاں نہیں ہے! لیکن ہاں، بے پردہ، بے نقاب حقیقت کبھی کوئی کائناتی نگاہ نہ دیکھ سکی۔ کسی نے اُس کے دیکھنے کی جرأت بھی نہیں کی۔ بے نقاب حقیقت انسان کی حدِ نگاہ سے باہر ہے۔ تاہم اگر تیری یہی ضد ہے، تو سمجھ لے، تجھے بڑی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ ایسی بڑی جس کی شاید تجھے قدرت نہیں۔ تجھے دولت، عظمت، حسن سب سے دست بردار ہوجانا پڑے گا۔ تجھے زندگی کا بھی آرزو مند نہ ہونا چاہیے۔ دیوتاؤں نے "حقیقت" سے بڑھ کر کوئی دولت کائنات کی اولاد کو نہیں دی ہے۔"

"میں ان سب سے ہمیشہ کے لئے بہ خوشی دست بردار ہوتا ہوں۔" دیوکلس نے خوش ہو کر کہا: "میں سورج بھی چھوڑنے پر تیار ہوں۔"

دیوی نے اپنا سر جھکا لیا۔ ہر طرف خاموشی پھیل گئی۔ درخت "زنس" کی اس باعظمت لڑکی کی تعظیم میں جھک گئے!

دیوی نے پھر سر اُٹھایا:

"بہتر" اس نے آدمیوں کی طرح لفظوں میں کہا "تجھے حقیقت دکھا دی جائے گی۔ لیکن ایک ہی مرتبہ میں تو اُسے نہیں دیکھ سکتا۔ میں ہر سال ایک دفعہ تجھے وہاں لے جایا کروں گی۔ تو اُسے چھپانے والے پردوں میں سے ہر مرتبہ ایک پردہ چاک کر سکے گا....... تو زندگی کے لباس میں رہے گا یہاں تک کہ حقیقت عریاں اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔"

× × × ×

نوجوان کا چہرہ مسرت و امید سے دمکنے لگا۔ وہ خاموش رہا کہ دیکھیں دیوی اب کیا کرتی ہے۔ اچانک وہ حیرت سے دم بخود ہوگیا۔ دیوی نے اپنی سنگِ مرمر کی چادر اُتار دی، دیوکلس کی آنکھیں دخترِ زنس کے حسن و جمال سے چکاچوند ہوگئیں۔ چشم زدن میں بُت نور کا پتلا بن گیا....... اب اس میں حرکت ہوئی........ اس نے نوجوان کو گود میں اُٹھا لیا۔ لامتناہی فضا میں پرواز شروع کر دی۔ ایک نامعلوم خطے میں جا پہنچی۔ دیوکلس نے دیکھا، ایک سربفلک پہاڑ پر وہ کھڑا ہے۔

یہاں، پہاڑ پر، نوجوان نے کالی بدلیوں کے اندر ایک پرچھائیں سی دیکھی، جو شناخت میں اس کی رُوح اُس کے حلقہ ہائے چشم میں سمٹ آئی، مگر وہ اس کے خدوخال نہ دیکھ سکا!

"یہی حقیقت ہے" دیوی نے اپنی انگلی سے اشارہ کر کے کہا "یہی اپنی دھندلی شعاعیں زمین پر ڈالتی ہے اور فلسفی اور حکیم ان میں نورِ حق کا سایہ ڈھونڈتے ہیں۔ اگر یہ شعاعیں نہ ہوتیں تو دنیا تاریک رات کی طرح اندھیری ہوجاتی۔ انسان کی نگاہ حقیقت کو ان ہی شعاعوں میں دیکھ سکتی ہے۔ تم دیکھ رہے ہو،........ وہ کس قدر ہلکی کیسی دھندلی شعاعیں ہیں، حقیقت بعید روشن ہے۔ اتنی روشن کہ سورج کی روشنی سے بھی تم اس کا قیاس نہیں کر سکتے مگر وہ ان پردوں کے اندر چھپی ہوئی ہے۔ صرف اس کا سایہ ہی نظر آتا ہے آگے بڑھ اور اس کا ایک پردہ چاک کر ڈال۔"

دیوکلس نے دیوی کے حکم کی تعمیل کی۔ ہاتھ لگتے ہی پردہ سفید پرند بن گیا۔ تھوڑی دیر نوجوان کے سر پر منڈلایا۔ پھر سیدھا آسمان کی طرف اُڑ گیا۔ دیوکلس نے اب دیکھا حقیقت کی شعاعیں پہلے سے زیادہ صاف اور روشن ہیں!

دیوی پھر اُسے زمین پر اڑا لائی۔ وہ اپنی اکیڈمی میں گیا اور دیوی پھر اپنا مرمریں جامہ پہن کر بت بن گئی!

× × × ×

دیوکلس نے دیوی سے اپنا وعدہ پورا کیا۔ آرام و راحت سے منہ موڑ لیا۔ خلوت میں بیٹھا اور غور و فکر میں یک قلم مستغرق ہو گیا۔

اب وہ انسانوں کے کسی مجمع پر نظر نہیں آتا تھا۔ ایتھنس کے تمام میلے اس سے خالی ہو گئے تھے۔

دوسرے سال اپنے مقررہ وقت پر وہ پھر سنگ مرمر کے بت کے سامنے سربسجود تھا۔ دیوی نے حرکت کی اور پہلی مرتبہ کی طرح اُسے غیر معلوم پہاڑ پر اڑا لے گئی۔ اب اُس نے حقیقت کا دوسرا پردہ چاک کر دیا۔ اس مرتبہ روشنی اور بھی زیادہ تیز ہو گئی، پھر وہ زمین پر واپس آ گیا۔ اُس کی زہد و خلوت پسندی اب اور بھی زیادہ گہری ہو گئی تھی۔

× × × ×

اس کے رفیق اس تبدیلی پر متعجب تھے۔ انھوں نے اُسے بہت بہت پھسلایا، مگر وہ اپنے گوشۂ تنہائی سے باہر نہ نکلا۔

ایتھنس کی بعض حسین دوشیزہ لڑکیوں سے اُس کی ملاقات تھی۔ ایک فتنہ گر حسن اس سے محبت بھی کرتی تھی۔ اُس کی یہ حالت دیکھ کر ایک دن اُس کے پاس گئی!

"دیوکلس، کیا بات ہے؟" دوشیزہ نے مسکرا کر کہا۔ تم مجھ سے بیزار کیوں ہو گئے؟ یہ دیکھو میری آنکھیں ستاروں کی طرح چمکتی ہیں۔ میرے بال شعاعوں سے بھی زیادہ چمکیلے ہیں۔ میرا جسم کیسا دلفریب ہے؟ میں نے تمہارے سوالِ محبت کا جواب دیا تھا، مگر اب میں خود تم سے جوابِ محبت کی سائل ہوں، مجھے دیکھو۔ میری محبت کی تحقیر نہ کرو۔ خود دیوتا بھی محبت سے انکار نہیں کرتے"

دیوکلس نے دوشیزہ پر ایک سرد نظر ڈالی اور کہا:

"محبت میرے دل سے اُسی طرح اڑ گئی ہے جس طرح دوسرا پردہ اڑ گیا تھا۔ اُس نے یہ کہا اور ایک طرف کو چل دیا!

دوشیزہ حیرت سے اُسے دیکھتی رہی۔ بھلا یہ رمز وہ کیونکر سمجھ سکتی تھی؟ اس نے خیال کیا، دیوکلس دیوانہ ہو گیا ہے۔

× × × ×

ایک سال بعد دیوکلس نے تیسرا پردہ چاک کیا۔ اس کی نظر اور بھی زیادہ تیز ہو گئی۔ اس کا نفسِ ناطقہ اور بھی زیادہ شائستہ اور بلند مرتبہ ہو گیا!

اب فلسفہ کے حلقوں سے بھی وہ الگ ہو گیا۔ اگر کبھی اتفاق سے وہ عوام کے سامنے بولتا تو لوگوں کے کان اُس کے لئے وقف ہو جاتے۔ انسانی دلوں کے لئے اُس کی آواز میں ایک ایسی تاثیر تھی کہ یونان کے مخمہائے حکمت میں کسی بڑے سے بڑے حکیم کی آواز کو بھی نہ ملی ہو گی۔ پورے ایتھنس نے متفق ہو کر فیصلہ کر دیا کہ دیوکلس استادِ عظیم افلاطون اور دوسرے تمام حکیموں سے بازی لے گیا ہے۔ اس سے منتیں کی گئیں کہ فلسفہ کی امامت قبول کرے۔ مگر اُس نے بے پروائی سے انکار کر دیا۔

اسی زمانے میں ایسا ہوا کہ ایتھنس پر دشمنوں نے حملہ کر دیا۔ دیوکلس وطن کی مدافعت میں پیش پیش تھا۔ بے نظیر شجاعت سے لڑا۔ آخر زخموں سے چور چور لوٹا۔ ایتھنس کو فتح ہوئی۔ بہادروں کو پھولوں کے تاج تقسیم کئے گئے۔ سب سے بڑا تاج دیوکلس کے واسطے تیار ہوا تھا۔ مگر عین وقت پر جب اُسے پکارا گیا تو وہ موجود نہ تھا!

× × × ×

برسوں پر برس گذرتے چلے گئے۔ ہر برس دیوکلس حقیقت کا ایک پردہ چاک کر آتا تھا۔ ابھی وہ جوان تھا۔ مگر اُس کا سر سفید ہو گیا۔ کمر جھک گئی۔ آنکھیں دھنس گئیں۔ قویٰ کمزور پڑ گئے۔ اس پر بھی وہ خوش تھا۔ کیونکہ عنقریب "حقیقت" کا مشاہدہ کرنے والا تھا۔ اُس حقیقت کا بے پردہ، بے نقاب مشاہدہ جسے کبھی کسی بشر نے نہیں دیکھا تھا!

× × × ×

آخر فیصلہ کی رات آ گئی۔ آج "حقیقت" پر سے آخری پردہ بھی اُٹھ جائے گا۔ آج بے نقاب حقیقت اُس کے سامنے ہو گی!

دیوی، دیوکلس کو حسبِ سابق اڑا لے گئی اور حسبِ معمول حقیقت کے سایہ کے سامنے کھڑا کر دیا:

"دیکھ حقیقت کس قدر تاباں ہے! پچھلے برسوں میں جتنے پردے تو نے چاک کئے وہ اس کے چہرے کے پردے نہ تھے۔ تیری ہی غفلت کے پردے تھے جو تو نے اپنی آنکھوں پر ڈال لئے تھے۔ تو نے ایک ایک کر کے تمام غفلتیں دور کر دیں۔ آج آخری پردے کی باری ہے۔ اس کے بعد تو رُو برو رُو حقیقت کا جلوہ دیکھ لے گا۔ اگر تو اپنے کئے پر پشیمان ہے، یا تیرے دل میں ذرا بھی خوف موجود ہے، تو اب بھی وقت ہے لوٹ جا، اور باقی زندگی چین سے گذار۔"

دیوکلس جوشِ طلب میں دیوانہ ہو کر چلایا:

اسی منزل کی طلب میں تو میں نے ساری عمر گذار دی۔ اب میں حقیقت سے

سے کس طرح منھ موڑ سکتا ہوں؟ میں آخری پردہ بھی چاک کر دوں گا۔ میں "حقیقت" کو ضرور بے نقاب دیکھوں گا"

اُس نے یہ کہا اور آگے بڑھا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ ہاتھ کانپنے لگا، وہ اپنی بزدلی پر شرمندہ ہو رہا تھا، مگر عمل کی ہیبت و دہشت سے بے بس تھا۔ اُس نے دانت بھینچے، آنکھیں بند کیں، دل کڑا کرکے آگے بڑھا، ہاتھ بڑھایا، اور آخری پردہ بھی کھینچ لیا....... اُف، ہولناکی!

پردہ ہٹتے ہی، روشنی غائب ہوگئی ——— گھٹا ٹوپ اندھیری چھاگئی...... کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا!

دیوکلس نے اتنے زور سے چیخ ماری کہ قریب تھا، اس کا سینہ شق ہو جائے!

"حقیقت" کہاں ہے؟ "حقیقت کہاں ہے؟ اے دیوی حقیقت کہاں ہے؟ مجھے تو کچھ سوجھائی نہیں دیتا۔ وہ، جو آخری پردے کے پیچھے تھی، کہاں چلی گئی؟ ساری دنیا تاریک ہو رہی ہے......"

"تیری آنکھیں پھوٹ گئیں!" حکمت کی دیوی نے وقار سے کہا "اے کائنات کے بیٹے، تیری آخری غفلت بھی اڑ گئی! بے نقاب حقیقت کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا۔ اگر دیکھ سکتا ہے تو اُسے پردوں ہی میں لپٹا دیکھ سکتا ہے۔ کوئی دس پردوں کے اندر سے دیکھتا ہے، کوئی اس سے کم میں دیکھتا ہے۔ کوئی اس سے بھی زیادہ میں۔ مگر حقیقت عریاں کا مشاہدہ ناممکن ہے...... تو نے دیکھنا چاہا! تو تو نے دیکھ لیا کہ تو کیا دیکھ سکتا ہے!......"

دیوکلس نے یہ سنا اور منھ کے بھل زمین پر گر پڑا۔ اب اُس کے جسم میں روح موجود نہ تھی...... شاید "حقیقت" کی جستجو میں اُس نے دوسری دنیا کی راہ لی تھی......"

پاکستان میں "سوغات" کا پتہ

اقبال یونس خاں، نہال چند محل مقابل فردوس سینما حیدرآباد سندھ مغربی پاکستان۔

پاکستانی حضرات اس پتہ پر تین روپیہ چندہ بھیج کر وصول یابی کی رسید ہمیں دہلی بھیج دیں۔ ان کے نام "سوغات" جاری کر دیا جائے گا۔

منیجر "سوغات" نئی دہلی

سکھوں کو اور سکھ مذہب کو سمجھنے کی ضرورت

دنیا کے مختلف اہلِ مذاہب میں آپس کی مخالفت زیادہ تر دو سبب سے ہے، ناواقفیت اور لفظوں کا پھیر۔ اگر اہلِ مذاہب ایک دوسرے کے عقیدوں اور اصولوں سے واقف ہو جائیں، اور لفظوں کے پھیر میں نہ پڑیں تو یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ جائیں گے کہ سب مذہب اپنی اصلیت میں ایک ہیں ان میں کوئی اختلاف نہیں۔ سب مذہب ایک ہی سچائی کی طرف بلاتے ہیں مگر الگ الگ زبانوں، بولیوں، لفظوں میں۔ شہد کے نام کی ایک چیز دنیا میں ہمیشہ سے چلی آ رہی ہے اور انسانوں کے لئے بڑی نعمت ہے۔ اسی چیز ـــ شہد ـــ کو کچھ انسان شہد کہتے ہیں، کچھ اس کا نام عسل رکھتے ہیں، کوئی اسے مادھو کہتا ہے، کسی نے اس کا نام ہنی رکھ چھوڑا ہے، اسی قسم کے اور بے شمار نام شہد کے دنیا کی زبانوں میں موجود ہیں لیکن حقیقت تو سب ناموں کی ایک ہی ہے یعنی شہد، اتنی سی بات لوگ سمجھ جائیں تو کتنے تعصب، کتنی دشمنیاں ختم ہو جائیں۔

اسی نقطۂ نظر سے آج ہم سکھ دھرم کے بارے میں کچھ عرض کر رہے ہیں، اس دھرم کے بانی بابا گرو نانک صاحب ہیں، اور اس دھرم کے سب سے نمایاں دو اصول ہیں: توحید اور عدم رہبانیت۔ خدا کے انسانی صورت میں ظاہر ہونے سے وہ قطعی انکار کرتا ہے، اور بت پرستی کے ساتھ ترک دنیا کو بھی ناجائز ٹھہراتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ انسان دنیا میں رہے اور انسانوں کی خدمت کرے۔

یہ تفصیل صاف ظاہر کر رہی ہے کہ سکھ مت اسلام سے کتنا قریب ہے، مگر ایسے حالات پیدا ہوئے کہ مغل سلطنت اور سکھوں میں تصادم ہوا، اور سکھوں کا ناحق خون بہایا گیا، مگر یہ جو کچھ ہوا سیاسی اسباب سے ہوا۔ دین دھرم سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ سکھوں کے دس گرو ہوئے اور دسویں گرو نے پہلے سب گروؤں کی تعلیمات گرنتھ صاحب میں جمع کر دیں۔ یہی کتاب سکھوں کی مقدس کتاب ہے اور اسی کے بموجب سکھوں کا عمل ہے۔

سکھ مذہب کے بنیادی اصول کا نچوڑ گرو نانک جی نے "جپ جی" میں نہایت اختصار سے بیان فرمایا ہے۔ یہ "جپ جی" دراصل مناجات ہے جس کا جاپ کرنا ہر صبح تمام سکھوں کے لئے ضروری قرار دے دیا گیا ہے۔ اس مناجات کے بعض حصے ذیل میں ملاحظہ کیجئے۔ ایڈیٹر

خدا ایک ہے۔ اس کا سچا نام ہے۔ وہ سب کو پیدا کرنے والا ہے۔ اُسے کسی
کا ڈر نہیں۔ نہ کسی سے دشمنی ہے۔ وہ کبھی نہ مرنے والا ہے۔ اُسے کسی نے پیدا نہیں کیا
وہ اپنا سہارا خود ہے۔ وہ بہت بڑا ہے اور اس کے پاس سب کچھ ہے۔

سچا خدا شروع میں تھا۔ اس سے قبل تھا۔ اب بھی سچ ہے۔ اور اے
نانک وہ ہمیشہ سچ رہے گا۔ میں سوچنے سے اس کو نہیں سمجھ سکتا چاہے لاکھوں
سوچوں۔ اور نہ چپ رہنے سے پتہ چلتا ہے چاہے بہت دیر سمادھی لگاؤں۔

ہم کیسے سچے ہو سکتے ہیں، اور یہ جھوٹ کا پردہ کیسے ٹوٹ سکتا ہے؟ آہ!
نانک! یہ صرف اس مالک کے حکم پر چلنے سے ہو سکتا ہے۔

اس کے حکم پر سب پیدا ہوتے ہیں، اس کے حکم کو بیان نہیں کیا جا سکتا
اس کے حکم سے زندگی ملتی ہے اور اسی کے حکم سے بڑائی ملتی ہے۔
اسی کے حکم سے بُرے اور نیچے اور دکھ سکھ ملتا ہے۔ اسی کے حکم سے کسی
کو بخش دیا جاتا اور کوئی سدا کے لئے چکر میں رہتا ہے۔

اس کے حکم کے اندر سب ہیں اور کوئی اس سے باہر نہیں۔ اے نانک! جس نے اس کے حکم کو سمجھ لیا وہ خود نما کے غرور میں نہیں رہتا۔

کون گا سکتا ہے اس کی طاقت؟ کس میں اتنی طاقت ہے؟ کون گا سکتا ہے اس کی بخششوں کو؟ اور کون جانتا ہے اُس کے نشان۔

کون گا سکتا ہے جو دُور دکھائی دے مگر نزدیک ہو۔ کون گا سکتا ہے اسے جو سب کو دیکھے اور ہمیشہ موجود ہو۔

کون گا سکتا ہے اُسے جس نے جسم کو سجا کر پھر خاک کر دیا ہو؟ کون گا سکتا ہے اُسے جس نے زندگی لے کر پھر دیدی ہو؟

اُس کا ذکر کرتے ہوئے ذکر کبھی ختم نہ ہوگا۔ لاکھوں نے لاکھوں طرح بیان کیا۔ مگر اُس کا بیان نہ دے سکے۔

دینے والا دیتا جاتا ہے، مگر لینے والا تھک جاتا ہے۔ ہر ایک زمانے میں انسان اُس کے رحم سے کھاتا ہے۔

اس نے اپنے حکم سے دنیا کے چلنے کا راستہ بتا دیا ہے۔ اے نانک خدا بے پروا اور خوش ہے۔

خدا سچا ہے۔ اور اس کا نام بھی سچا ہے۔ جو بے حد محبت سے لیا جاتا ہے۔ لوگ دعا کرتے ہیں اور مانگتے ہیں کہ خدا دیدے اور داتا بخشش کرتا ہے۔

پھر ہم کیا پیش کر سکتے ہیں کہ اُس کا دربار دکھائی دے، اور منہ سے کیا بولیں جسے سن کر وہ ہمیں پیار کرے۔

نور کے تڑکے اس کے سچے نام اور بڑائی پر غور کر۔ ہمارے "کرم" (عمل) سے ہمیں عزت ملے گی اور ہم موکش کے دروازے تک پہنچیں گے۔

جب ہاتھ پاؤں اور جسم گندے ہو جاتے ہیں تو پانی کے دھونے سے گندگی دور ہو جاتی ہے۔

جب پیشاب کی وجہ سے کپڑے پلید ہو جائیں تو صابون لے کر دھوئے جاتے ہیں۔

اسی طرح جب دل پاپوں سے بھرا ہوا ہو۔ تو "اس کے" نام سے پیار رکھنے سے صاف کیا جاتا ہے۔ صرف کہنے سے پُن کرنے والا یا پاپ کرنے والا نہیں بن جاتا۔ اعمال کا چٹھا لکھا ہوا ساتھ جاتا ہے۔

خود ہی بیج بو اور خود ہی پھل کھا۔ اے نانک! خدا کے حکم سے انسان آتا اور جاتا ہے۔

تیرتھ جانا۔ تپ کرنا۔ رحم کھانا اور خاص عام دان دینا ایسا کرنے سے تل برابر (یعنی معمولی سی) عزت حاصل ہوتی ہے۔

مگر جس نے نام سنا۔ خدا کو مانا اور دل میں اس کو پیار رکھا تو من کے تیرتھ میں میل دھوئے گا۔ اے خدا سب اچھائیاں تیری ہیں میری نہیں۔ بغیر کام کے بھگت نہیں بن سکتا۔

صرف وہی خدا سدا رہتا ہے جس کا نام سچا ہے جس نے یہ سب رنگ رچائے ہیں۔ وہ موجود ہے اور موجود رہے گا چاہے سب دنیا تباہ ہو جائے، وہ نہ جائے گا۔

رنگ رنگ کی چیزیں، مختلف جنسیں جس نے بنائی ہیں، وہ اپنے کئے کو دیکھتا ہے جس میں سے اُس کی بڑائی نظر آتی ہے۔

جو اُسے منظور ہے وہی کرے گا۔ کوئی اسے حکم نہیں دے سکتا۔ وہ بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔ اے نانک باقی سب اُس کی رضا کے تحت ہیں۔

اگر تم نے اپنے من کو جیت لیا تو دنیا کو جیت لیا۔

وہ خدا ہر جگہ ہے اور ہر جگہ اس کے خزانے ہیں جو کچھ اس کو اُن میں ڈالنا تھا سو ایک ہی دفعہ ڈال دیا وہ یہ سب بنانے والا۔ بنا بنا کر ان کو دیکھتا ہے (پرورش کرتا ہے)

تعریف کرنے والے اس کی تعریف کرتے ہیں۔ مگر اس کی بڑائی کا علم نہ ہوا جس طرح ندیاں اور دریا جو سمندر میں گرتے ہیں مگر سمندر کی گہرائی معلوم نہیں کر سکتے۔ سمندروں کے شاہ اور سلطان جن کے پاس دھن اور مال کے پہاڑ ہیں، اُس کیڑے کے برابر بھی نہیں جو خدا کو من سے نہیں بھولتا۔

"اس" کی صفتوں کا کوئی خاتمہ نہیں اور نہ کہنے سے ختم ہوتی ہیں۔ اُس کی مہربانیوں کا اخیر نہیں اور نہ اُس کی عطا کا اخیر ہے۔

تمہارے نام کے بغیر کوئی جگہ نہیں ہے۔ مجھ میں کیا طاقت ہے کہ میں تمہارا بیان کر سکوں۔

میں اتنا بے طاقت ہوں کہ ایک دفعہ بھی قربان نہیں کیا جا سکتا۔ جو تجھ کو منظور ہے وہی میرے لئے اچھا ہے۔

اے خدا! صرف تم ہی ہمیشہ کے لئے سلامت رہو گے۔

قطعہ

کوئی آواز اب نہیں آتی
روز کی کشمکش سے مجبور ہیں
نغمۂ زار نغمہ خاموش
اب ساز دل کے تار ٹوٹ گئے

مخمور دہلوی

ایک قدیم رومانی کہانی

انتظار

جناب وشواناتھ طاؤس

عشق ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ وہ کونسا انسانی دل ہے جو محبت سے خالی ہے جس میں شمع محبت فروزاں نہیں۔ شاہ اور گدا، مفلس ہو یا امیر، خاک نشین، رند ہو یا عبادت گزار سب کے دل میں محبت کی چنگی دھڑکن موجود ہے۔ تھریس و لیش کی ملکہ نلس بھی اس کی ازلی طاقت اور وسیع جال سے نہ بچ سکی۔ کیوپڈ نے اس کے دل میں عشق کے ایسے تیر پیوست کئے کہ زندگی وبال جان ہو گئی۔

ملکہ نلس بڑی شان و شوکت سے تھریس پر حکومت کرتی تھی۔ اس کی حشمت و عظمت کے پرچم گھٹاؤں کی طرح فضا میں لہراتے تھے۔ رعایا اس پر جان چھڑکتی تھی۔ اور آس پاس کے حکمراں اُسے عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ لیکن اس پُرامن و پُرسکون ماحول کے باوجود وہ مغموم اور رنجیدہ رہتی تھی کوئی اس کے رنج و غم کا سبب نہیں جانتا تھا۔ کسی کو اُس کے دل میں چھپے ہوئے درد کا علم نہ تھا۔

ایک دن تھریس کے ساحل پر ایتھنز کے شہزادے دیمفون کا جہاز لنگر انداز ہوا۔ ملکہ کو جب شہزادے کی آمد کی خبر ملی تو وہ فوراً گاڑی میں سوار ہو کر اس کے خیر مقدم کے لئے ساحل سمندر پر گئی۔ دونوں کے ہاتھ ملے نظریں چار ہوئیں ملکہ کے سرخ و شاداب لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ شہزادے نے بھی اپنی نیلگوں چمکیلی آنکھیں اس کی آنکھوں سے اس طرح ملائیں گویا وہ اپنے دل کی تمام محبت اس کی آنکھوں میں انڈیل دینا چاہتا ہے۔ کچھ دیر وہ اسی طرح ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ پھر کچھ رسمی بات چیت کے بعد ملکہ شہزادے کو اپنے محل میں لے گئی۔

شہزادہ کئی روز تک تھریس میں مہمان رہا۔ اس کی خاطر تواضع میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا گیا۔ ملکہ ہر لمحہ اس کے ساتھ رہتی۔ کبھی اسے اپنے ہمراہ کشتی پر سیر کراتی اور کبھی اپنے ملک کے قدیم محلات دکھانے لے جاتی۔ شہزادہ بھی ہر روز اسے اپنی گذشتہ مہمات کا حال سناتا اور اپنے ملک کی عجیب کہانیاں بیان کرتا۔ ملکہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑے اشتیاق و انہماک سے اس کی باتیں سنتی

کئی دن اسی طرح بیت گئے۔ شہزادہ دیمفون ملکہ نلس کی زلف گرہ گیر کا بری طرح اسیر ہو چکا تھا لیکن اسے وطن اور والدین کی یاد بھی بے طرح ستا رہی تھی۔ اس نے وطن واپس جانے کی خواہش ظاہر کی۔ ملکہ کو اس کی مفارقت گوارا نہ تھی۔ وہ لمحہ بھر کے لئے بھی اسے اپنی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دینا چاہتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ محبوب کے فراق میں وہ زندہ درگور ہو جائے گی۔ لیکن شہزادہ کے بار بار اصرار کرنے پر اس نے سینے پر صبر کا پتھر رکھ کر جانے کی اجازت دیدی۔

ملکہ نے شہزادے کے جہاز کو خوب سجایا۔ اور اپنی ایک تصویر بھی اس میں آویزاں کر دی تاکہ وہ ہر وقت اپنے محبوب کی نظروں کے سامنے رہے شہزادے نے بہت جلد لوٹ آنے کا وعدہ کیا۔ اور رخصت ہو گیا ملکہ محل کی چوٹی پر سے اس کے جہاز کو دیکھتی رہی۔ آہستہ آہستہ جہاز چھوٹا ہوتا گیا یہاں تک کہ وہ اُفق میں غائب ہو گیا۔

شہزادے کے چلے جانے کے بعد ملکہ کی حالت پھر پہلے کی سی ہو گئی۔ وہی خاموشی اور وہی اُداسی۔ اسے اپنی روزمرہ کی زندگی میں ایک خلا سا محسوس ہونے لگا۔ اسے نہ دن کو چین تھا۔ اور نہ رات کو قرار وہ ہر وقت ہجر یار میں ماہی بے آب کی طرح تڑپتی اور آتش بے قرار کی مانند جلتی بس وہ تھی اور دیمفون کا پیارا پیارا تصور۔

وقت گذرتا گیا۔ دن بیتتے گئے۔ لیکن شہزادہ نہ آیا۔ اس کا انتظار کرتے کرتے ملکہ کی آنکھیں تھک گئیں۔ جدائی کا عرصہ لمبا ہوتا چلا گیا۔ وہ اکثر اپنا سنہری لباس زیب تن کر کے سمندر کے کنارے پر جاتی اور گھنٹوں وہاں کھڑی رہتی۔ یونہی کھڑے کھڑے دن بھی ڈوب جاتا۔ مگر جہاز نہ آنا تھا نہ آیا۔ وہ سمندر کے دیوتا سے التجائیں کرتی۔ اسے چڑھاوے چڑھاتی۔ اس کی لہروں پر عقیدت کے پھول بکھیرتی۔ لیکن اس کے دل کی مراد پوری نہ ہوئی۔

شہزادے کی فرقت میں ملکہ کا بُرا حال ہو گیا۔ وہ زار و قطار روتی کپڑے پھاڑ لیتی، بالوں کو نوچ ڈالتی۔ اور دیواروں سے سر ٹکراتی۔ بہتیری دعائیں مانگی گئیں۔ منتر وافسوں سے کام لیا گیا۔ آسمانی دیوتاؤں کو خوش

کرنے کی رسمیں پوری کی گئیں۔ مگر ملکہ کے دل کو قرار نصیب نہ ہوا۔ جاڑے اسی طرح گذر گئے۔ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ پیار میں اب اور انتظار کرنے اور تڑپنے کی سکت نہ رہی۔ وہ ساحل پر گئی۔ بڑی حسرت و یاس کی نظر سے دیکھا۔ لیکن بے کار۔ جہاز کا نشان تک نظر نہ آیا۔ آخر وہ سمندر کی موجوں میں کود کر زندگی کی غمناکیوں سے نجات پاگئی۔ جسم مٹ گیا۔ مگر محبت پھر بھی تھریس کی فضاؤں میں گونجتی رہی۔

ملکہ کی اچانک موت سے سارا تھریس ماتم کدہ بن گیا۔ لوگوں نے اپنی مہربان ملکہ کی بے وقت جدائی کو بُری طرح محسوس کیا۔ وہ اس کی یاد میں خون کے آنسو بہا رہے تھے۔ انھوں نے بہت عزت و احترام کے ساتھ اسے دفن کیا اور اس کی یاد کو قائم و دائم رکھنے کے لئے ایک شاندار مقبرہ تیار کرایا۔ اس کے در و دیوار پر ملکہ کی سوانح کندہ کی گئی۔ اور اس کے جشن سخاوت اور انصاف کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ ملکہ کے دستور کے مطابق مزار پر بادام کا ایک درخت بو دیا گیا۔ موسم بہار آتا تو درخت کی پتیاں نم ہو جاتیں۔ لوگ ان پتیوں کو دیکھ کر کہتے "ہماری ملکہ مرنے کے بعد بھی شہزادہ دیمفون کی فرقت میں آنسو بہا رہی ہے"

دو برس بعد شہزادہ اپنے ملک سے وہاں واپس آیا۔ وہ محل کے دروازے پر پہنچا۔ اور دربان سے ملکہ کی خیریت دریافت کی۔ دربان خاموش رہا اور اسے ملکہ کے مزار پر لے گیا۔ شہزادے نے مزار پر لکھی ہوئی عبارت کو دیکھا۔ لکھا تھا:

"یہ ہماری پیاری ملکہ کی قبر ہے جو شہزادہ دیمفون کا انتظار کرتے کرتے ابدی نیند سو گئی"

شہزادہ بڑی آرزوؤں اور اُمنگوں کے ساتھ ہمیشہ کے لئے اپنے وطن کو خیر باد کہہ کر یہاں آیا تھا۔ وہ ملکہ کے ساتھ شادی کرکے محبت کی ایک سہانی جنت تعمیر کرنا چاہتا تھا۔ مگر محبوبہ کی موت نے اس کے تمام ارادوں پر پانی پھیر دیا۔ اس کی اُمیدوں اور ارمانوں کا خون ہوگیا۔ زندگی کی ساری خوشیاں ابن کر موت کے دریا میں بہہ گئیں۔ وہ ہر روز مزار پر جاتا اور زور زور سے ملکہ کو آوازیں دیتا۔ مگر اس کی چیخیں فضا میں گم ہو کر رہ جاتیں۔ تقدیر کی سب سے بڑی ٹھوکر اس سے برداشت نہ ہو سکی اور ایک روز وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنی محبوبہ سے جا ملا۔

تھریس والوں نے اپنے مہمان شہزادے کی لاش کو ملکہ کے مزار کے ساتھ ہی دفن کیا اور اس کی قبر پر بھی بادام کا ایک درخت لگا دیا۔ اب بھی بہار آتی ہے تو بادام کے ان درختوں کی پتیاں نم ہو جاتی ہیں۔

فریاد (باقی صفحہ ۱۴)

(۵۷)

آگ فاران کے سینہ میں لگائی تو نے — غزوۂ بدر میں مچادی دہائی تو نے
بانسری فتح کی تھرا؎ میں بجائی تو نے — نیل میں ہیبتِ فرعون بہائی تو نے
کیوں اسی طرح نہ باطل کو ہزیمت ہو آج — کل کا وعدہ ہے مگر کیوں نہ نیابت ہو آج

(۵۸)

اور میں کیا کہوں چارہ نہیں قدرت ہے تری — دخل کیا بندۂ شاعر کو مشیت میں تری
پھر بھی انصاف کی یہ عرض ہے خدمت میں تری — جھگڑے دل کے ہوں بیرونِ عدالت میں تری
ہے یہ انسان کا دل تیرا نہاں خانہ بھی — اور یہی تیری رحیمی کا ہے پیمانہ بھی

(۵۹)

میرے مالک میری محنت کا ثمر بھی تجھ سے — چشمِ بیتاب کا یہ ذوقِ نظر بھی تجھ سے
پہلوئے عشق میں یہ دردِ جگر بھی تجھ سے — گریۂ فریاد بھی تجھ سے ہے اثر بھی تجھ سے
لکنتِ شاعرِ ژولیدہ بیاں بھی تیری — نطق بھی تیرا عطیہ یہ زباں بھی تیری

(۶۰)

کیوں نہ بہکوں کہ تخیل ہے پریشان میرا — عشق کیا عقل نے پھاڑا ہے گریبان میرا
کشتۂ نازِ خرد ہے دلِ نادان میرا — ابھی تشکیک کی منزل میں ہے ایمان میرا
ہو شمار اس کا بھی مالک مری نادانی میں — میں جو گستاخ ہوں آئینِ غزل خوانی میں

؎ بہار میں باٹ کو بنگرا کہتے ہیں اور شاعر صوبہ بہار کا باشندہ ہے۔

زمین پر کائناتِ حیات کا آغاز

ادارہ

روئے زمین پر ذی روح مخلوقات بہت مدت سے موجود ہیں۔ ماہرین طبقات الارض کا تخمینہ دس کروڑ سال کا ہے۔ بلاشبہ یہ تخمینہ ظنی ہے۔ لیکن یہ یقینی ہے کہ بہت قدیم زمانوں سے زمین پر زندگی موجود ہے۔ زمین کی زیادہ سے زیادہ گہری اور پرانی پرتوں اور تہوں میں بھی زندہ کائنات کے نشان ملتے ہیں۔

نظامِ شمسی

زمین پر زندگی کا آغاز کب سے ہوا اور کس طرح ہوا؟ اس سوال سے پہلے یہ بحث سامنے آتی ہے کہ موجودہ صورت اختیار کرنے سے پہلے خود زمین کی حالت کیا تھی، اور اس پر کتنے دَور انقلاب کے گذر چکے ہیں؟

زمین نظامِ شمسی میں داخل ہے۔ اس نظام میں آفتاب مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور سیارے (گردش کرنے والے ستارے) اس کے گرد گھوم رہے ہیں۔ یہ ستارے سورج سے بہت دور ہیں۔ مرکز سے جتنی دوری بڑھتی ہے اسی قدر فاصلہ بھی زیادہ ہوجاتا ہے۔ ذیل میں تخمینی فاصلہ ملاحظہ کیجئے:۔

عطارد ——— ۱،۴۰،۰۰،۰۰۰ ——— میل
زہرہ ——— ۶۰،۰۰،۰۰۰ ——— "
زمین ——— ۳،۷۰،۰۰،۰۰۰ ——— "
مریخ ——— ۵،۶۰،۰۰،۰۰۰ ——— "
مشتری ——— ۱۹،۲۰،۰۰،۰۰۰ ——— "
زحل ——— ۵۵،۵۰،۰۰،۰۰۰ ——— "
اورانوس ——— ۷۳،۰۰،۰۰،۰۰ ——— "
نیپٹون ——— ۱،۱۵،۰۰،۰۰،۰۰۰ ——— "

مریخ اور مشتری کے درمیان ایک عظیم دائرہ موجود ہے۔ اس میں سو سے زیادہ چھوٹے چھوٹے سیارات آفتاب کے گرد گردش کرتے ہیں اور اس سے تقریباً دس کروڑ میل دور ہیں۔

ہر بڑے سیارے کے ساتھ ایک یا کئی چاند ہیں اور اس کے گرد چکر لگاتے رہتے ہیں۔ چنانچہ زمین کے ساتھ ۱، مشتری کے ساتھ ۴، زحل کے ساتھ دس، اورانوس کے ساتھ ۴ اور نیپٹون کے ساتھ ۱ ہے۔

آفتاب اپنے مرکز میں رہ کر تمام کواکب کو اپنی طرف جذب کرتا اور کھینچتا ہے۔ یہ تمام کواکب اور آفتاب مختلف قسم کی دھاتوں، چٹانوں اور پگھلی ہوئی گیسوں سے مرکب ہیں۔ یہ دھاتیں اسی قسم کی ہیں، جیسی زمین میں ہم دیکھتے ہیں۔ آفتاب ان تمام کواکب سے بہت بڑا ہے۔ زمین کا قطر اس کے مقابلے میں صرف ۱/۱۰۸ ہے۔ زمین کا حجم آفتاب کے حجم کے سامنے صرف ۱/۱۲۸۰۰۰۰ ہے۔ مشتری سب سے بڑے ستاروں میں ہے مگر اس کا قطر آفتاب سے ۱/۱۰ کی نسبت رکھتا ہے۔ فلکیوں نے تمام کواکب اور آفتاب کے وزن کا بھی تخمینہ لگایا ہے۔ ان کے اندازے میں آفتاب اپنے تمام کواکب کے مجموعی وزن سے بھی سات سو گنا زیادہ وزنی ہے۔ زمین تو اس کے مقابلے میں بالکل ہی بے حقیقت ہے۔ وہ زمین سے ۳۳۴۰۰۰ گنا زیادہ وزنی ہے۔

آسمان پر آفتاب کے علاوہ اور نظامِ شمسی سے باہر بعض اور کرّے بھی موجود ہیں۔ ان میں سے بعض نظامِ شمسی سے بھی زیادہ بڑے ہیں۔ یہ "ابتھر" اور گیسی مواد سے مرکب ہیں۔ اور خود اپنے گرد گردش کرتے رہتے ہیں۔

اس مشاہدے کے بعد اگر ہم نظامِ شمسی کو دیکھیں اس کے انداز پر غور کریں اور اپنے مرکزی آفتاب اور اس کے حلقے کے کواکب کی گردش پر نظر ڈالیں، پھر اس کے بعد ابتھر کے کُرّوں پر غور کریں، تو باہمی مشابہت کی وجہ سے فوراً ذہن میں یہ خیال پیدا ہوجاوے گا کہ شاید آفتاب کی تاریخ ابتھری سے وابستہ ہے۔

اس خیال کی تائید اس امر واقع سے اور بھی ہوتی ہے کہ اگر ہم کسی سیّال مادہ میں گردشی حرکت پیدا کردیں تو فوراً دیکھیں گے کہ وہ کئی حلقوں میں تقسیم ہوگیا ہے، سب حلقے مرکز کے گرد گھوم رہے ہیں اور خود ہر حلقہ

اپنے اندر ایک گردشی حرکت رکھتا ہے۔ جیسا کہ ابھی معلوم ہوگا۔

زمین میں حرارت

اگر ہم زمین کے اندر اُتریں (جیسا کہ "کانوں" میں یا کنویں کھودتے وقت دیکھا گیا ہے) تو ہر ۳۳ میٹر گہرائی میں حرارت سینٹی گریڈ کا ایک درجہ بڑھتی جائے گی۔ اس حساب سے ایک لاکھ کیلومیٹر نیچے' حرارت کا درجہ تقریباً تین ہزار ہوگا۔ معلوم ہے کہ اتنی حرارت جملہ معدنیات کے پگھلا ڈالنے اور اکثر معلوم مرکبات کو گیس بنا دینے کے لئے بالکل کافی ہے۔ پھر ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ زمین کا نصف قطر تقریباً چھ ہزار کیلومیٹر (۶۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰ میٹر) ہے۔ اسی بنا پر زمین کے حصے کا مرکزی حجم جو پگھلی ہوئی معدنی مواد سے مرکب ہے' جو اس کی اس سطح یا چھلکے سے بہت زیادہ ہے' جس پر ہم آباد ہیں۔

زمین کا مرکزی حصہ سیال ہے یا ٹھوس؟ اس بارے میں علماء میں اختلاف ہے۔ بڑا گروہ اسے ٹھوس بتاتا ہے' کیونکہ زمین کی منجمد سطح اور اس کے اوپر کی فضا اپنا بوجھ ڈالے ہوئے ہے۔ زمین پر اس وقت جس طرح کے آتش فشاں پہاڑ نظر آتے ہیں' ایسے ہی پہاڑ اُن قدیم زمانوں میں بھی موجود تھے جو زمین کی عمر کا ابتدائی زمانہ تھا۔ اصطلاح طبقات الارض میں یہ دور "عہدِ ناری" کہلاتا ہے۔

گرم چشموں کا وجود اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ باطن ایک عظیم مشتعل کرہ ہے۔ کیونکہ جز ہمیشہ کُل کے ماتحت ہوتا ہے اس لئے عملاً تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ زمین کی یہ پتلی پپڑی یا چھلکا ایک زمانے میں اپنے کُل کی طرح مشتعل ہوگا۔ زمین اپنی تاریخ کے کسی قدیم دور میں آتشی کرہ تھی

کانٹ اور لاپلاس کا نظریہ

اس طرح کے مشاہدات پر غور کرنے کے بعد جرمن فلاسفر کانٹ اور اس کے بعد فرنچ ریاضی داں لاپلاس نے یہ نظریہ قائم کیا کہ شروع میں پورا نظام شمسی نہایت ہی گرم گیس کا گولا تھا۔ یہ گولا کسی نامعلوم محرک کے ذریعہ خود اپنے گرد گھومنے لگا۔ اس حرکت نے حلقے پیدا کئے۔ پھر اُن کے مرکز میں کثافت اور جماؤ پیدا ہوگیا اور ایک کیفیت کے بعد یہی مرکز آفتاب بن گیا۔ پھر گردشی حرکت کی وجہ سے ان حلقوں کے اندر بھی حلقے پیدا ہوتے گئے۔ ان ثانوی حلقوں میں سے ہر حلقے کے مرکز میں کثافت اور انجماد کی کیفیت پیدا ہوئی اور ایک نیا کوکب ناری بن گیا۔ پھر اس مرکز سے محیط حلقوں میں بھی کثافت اور انجماد کا عمل شروع ہوا اور بتدریج ایک یا کئی چاند پیدا ہوگئے۔ مگر یہ بھی اُس وقت آتشیں تھے۔ رفتہ رفتہ ٹھنڈے ہو کر موجودہ شکل میں آئے ہیں۔ بعض کواکب کے گرد اب تک اُس تاریخی عہد کے حلقے موجود ہیں۔ چنانچہ زحل کے گرد علاوہ اس کے دس چاندوں کے تین تہیں رکھنے والا گیسی حلقہ بھی دکھائی دیتا ہے۔

خاص زمین کے متعلق مذکورہ بالا علماء کا نظریہ یہ ہے کہ وہ رفتہ رفتہ ٹھنڈی ہونا شروع ہوئی یہاں تک کہ اس کی سطح جم گئی۔ جب زمین کی حرارت ۳۵۰ درجہ پر پہنچی تو اس پر پارے کی موسلا دھار بارش ہوئی۔ جب حرارت اور کم ہوئی اور ۱۰۰ درجہ پر آئی' تو کھولتے ہوئے پانی کی بارش شروع ہوگئی مگر چونکہ زمین اور اس کی فضا کی حرارت ہنوز بہت زیادہ تھی۔ اس لئے پانی جمع نہ ہو سکا اور بھاپ بن کر اڑ گیا۔ پھر جب حرارت ۱۰۰ درجہ سے بھی کم ہوگئی' تو اس وقت بارش کا پانی جمع ہوا اور سمندروں کی تکوین ہوئی' اس زمانے کے سمندروں کا رقبہ موجودہ زمانے کے سمندروں سے بہت زیادہ تھا۔ کیونکہ اس وقت زمین کا اندرونی حصہ بسبب حرارت کی زیادتی کے پانی سے خالی تھا۔ اور اس کی موجودہ سلوٹیں وجود میں نہیں آئی تھیں جنھوں نے بعد میں پہاڑ اور سمندروں کی گہرائیاں بنائیں۔ سمندر کے متعلق یہ خیال محض نظریہ نہیں بلکہ علماء طبقات الارض کا مشاہدہ ہے۔

کائناتِ حیات

اب زندہ کائنات کی بحث سامنے آتی ہے۔ ظاہر ہے بہت شدید حرارت میں زندگی موجود نہیں ہو سکتی۔ اس لئے لازمی طور پر تسلیم کرنا پڑے گا کہ زمین اپنے اولین زمانے میں زندگی سے خالی تھی۔ یہ تسلیم کرنے کے معنی یہ ہوئے کہ ہم یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ زمین پر زندگی ہمیشہ سے موجود نہیں تھی۔ بعد میں شروع ہوئی۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ زندگی یا پہلے ذی روح کائنات کا آغاز کن مواد سے ہوا؟ کیا اُن بچے ہوئے معدنی مواد سے جو شدید حرارت کی وجہ سے اولین سمندروں میں پانی کی طرح بہہ رہے تھے' اور گرمی کے کم ہونے پر جم گئے؟ اگر یہ مان لیا جائے تو بحث ختم ہو جاتی ہے۔

دو مذہب

لیکن بعض موانع ایسے موجود ہیں کہ اس بات کو فوراً تسلیم کر لینا ممکن نہیں۔ اس کا فیصلہ اس مسئلہ کے فیصلہ پر موقوف ہے کہ غیر ذی روح اشیاء

پیدا ہو سکتی ہیں یا نہیں ؛ اس بارے میں جمہور اہل علم کا مذہب یہ ہے کہ نہیں ہو سکتیں یا کم از کم نہیں ہوتی ہیں لیکن تولیدِ ذاتی کے قائل اس کے خلاف ہیں۔

مذہب جمہور کی بنیاد راسخ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس طرح کی کوئی تخلیق علمی طریقہ پر ثابت نہیں ہوئی ہے۔ ایک زمانے میں عوام کا یہ خیال، خواص میں بھی پھیلا ہوا تھا کہ بہت سے جانور، مٹی، اور مختلف غیر ذی روح مواد سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً وہ سمجھتے تھے کہ حشرات الارض مٹی اور پانی سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ مکھیاں اور مچھر گندگی سے پیدا ہو کر اڑنے لگتے ہیں۔ یا پنیر اور اسی طرح کی چیزوں میں خود بخود کیڑے رینگنے لگتے ہیں۔ لیکن اب تحقیقات سے ثابت ہو گیا کہ تمام جاندار غیر جاندار مادے سے پیدا نہیں ہوتے، بلکہ جاندار مخلوق ہی سے جان حاصل کرتے ہیں۔ ان سب کی پیدائش مختلف قسم کے کیڑوں اور مکھیوں کے انڈوں سے ہوتی ہے جن میں بعض چشم غیر مسلح سے اور بعض خوردبینوں سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ پنیر کے کیڑوں پر ایک زمانے میں بہت زور دیا جاتا تھا۔ مگر ثابت ہو گیا کہ وہ ایک خاص قسم کی مکھی کے انڈوں سے پیدا ہوتے ہیں اور اگر ان کی حفاظت کی جائے تو وہ بڑے ہو کر مکھی کی شکل اختیار کر لیں گے۔ یہ بات سترھویں صدی کے وسط ہی میں تحقیق ہو گئی تھی کہ مٹی وغیرہ سے جانداروں کی پیدائش کا خیال غلط ہے۔

لیکن دوسرا مذہب اُن لوگوں کا ہے جو تولیدِ ذاتی کے قائل ہیں۔ خوردبین کی ایجاد نے انہیں تقویت دی۔ انھوں نے اعلان کیا کہ ایک خاص طرح کے جاندار مردہ پتیوں کے رس جیسے سیال مادوں میں پیدا ہو جاتے ہیں لیکن سپلین آڈورز اور شوآن وغیرہ علماء علم الحیات نے اس سے انکار کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم ان سیال مادوں کو آگ پر رکھ کر کھولائیں اور ان جراثیم سے آلودہ نہ ہونے دیں جو ہوا میں موجود ہیں، تو ان میں کبھی یہ جاندار پیدا نہ ہوں گے۔ یہ بھی دراصل ہوا کے جراثیم کی پیداوار ہیں۔

مذہب "تولدِ ذاتی" کے ماننے والوں نے جراثیم (خوردبینی کیڑوں) کی نسبت بھی دعوی کیا تھا کہ یہ اُن قابلِ حیات اور معدنی مواد سے پیدا ہوتے ہیں جو سیال مادوں اور بیمار جسموں میں موجود ہیں۔ لیکن پاسٹیور نے اس کو غلط ثابت کیا۔ اُس نے ثابت کیا کہ اس میں بھی وہی غلطی ہے جو بڑے جانوروں کی پیدائش کے سلسلے میں ہوئی تھی۔ یہ جراثیم بھی ہوا کے جراثیم سے پیدا ہوتے ہیں اور ایک جان سے دوسرے وجود کی جان پیدا ہوتی ہے چنانچہ اس نے تجربہ کر کے دکھا دیا کہ انجکشن کا قوام، گوشت کا ست، اور آلو جیسی ترکاریاں جان کی مزعومہ پیدائش کا سب سے بہتر اور اصل محل ہیں، جب ہوا سے بالکل محفوظ کر دی جاتی ہیں یا بہت اچھی طرح اُبال دی جاتی ہیں تو ان میں جراثیم کی پیدائش بالکل نہیں ہوتی۔ موجودہ علماء مادیین کا خیال ہے کہ پاسٹیور نے اپنے تجربات سے مذہب "تولدِ ذاتی" کی دلیلیں کمزور کر دی ہیں۔

عہدِ آخر کے حکماء میں آرنسٹ ہکل، مذہب "تولدِ ذاتی" کا سب سے بڑا عالم ہے۔ وہ کہتا ہے "اگر فی الحال تولدِ ذاتی کا وقوع ناممکن نظر آتا ہے تو اس سے بطلان لازم نہیں آتا کیونکہ جس زمانے میں یہ واقع ہوا تھا، اس وقت سمندروں کا پانی ایک خاص حالت اور کیمیاوی کیفیت رکھتا تھا۔ حرارت کا درجہ، نمک کی نوعیت اور پگھلے ہوئے گیسوں کی کیفیت کچھ اور ہی طرح کی تھی۔ ایک محدود زمانے تک یہی حالت رہی۔ پھر اُس کے بعد کبھی پیش نہیں آئی۔ لہٰذا تولدِ ذاتی کے اس وقت محال نظر آنے سے یہ ثابت نہیں ہو سکتا کہ اُس وقت بھی محال تھا۔ اب زمین کی وہ حالت باقی نہیں رہی ہے، جو اس وقت تھی جب تولدِ ذاتی شروع ہوا تھا۔

لیکن اس مذہب کے مخالف کہتے ہیں، مشاہدہ اس خیال کی تصدیق نہیں کرتا۔ علماء علم الحیات نے سخت کوششیں کیں۔ طرح طرح کے تجربے کئے، ہر قسم کے ماحول تیار کئے، مختلف مواد میں گرمی پہنچائی۔ حرارت اور تمام معلوم شعاعوں کی روشنی مہیا کی، لیکن پھر بھی زندگی بے جان مواد سے پیدا نہ ہو سکی۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ زندگی کے آغاز کے وقت سمندروں کی حالت کیسی ہی خاص اور زندگی پیدا کرنے کے لئے صالح کیوں نہ ہو، لیکن اس حالت سے بہتر نہیں ہو سکتی جو مختلف وسائل جمع کر کے علماء حیات نے اب مہیا کر دی ہے۔ تاہم کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔

مختلف نظریے

پھر آخر زمین پر زندگی کا آغاز کیونکر ہوا؟ اوپر کی بحث سے یہ گتھی ذرا بھی نہ سلجھی۔

ایک بہت بڑا ماہر علم الحیات لکھتا ہے، زمین پر زندگی ننھے ننھے کیڑوں اور جراثیم کی شکل میں آئی۔ مگر یہ اُن چھوٹے بڑے معدنی ٹکڑوں کے ذریعہ پہنچی تھی، جو دوسرے ستاروں سے ٹوٹ کر ہماری زمین پر گرے تھے اُس وقت زمین اس زندگی کے لئے مناسب ماحول رکھتی تھی، اس عالم کا خیال ہے کہ کوکب میں زندگی ازل سے موجود ہے۔ ان ہی کواکب کے اجزاء

ٹوٹ کر دوسرے کواکب میں زندگی پہنچا رہے ہیں۔

مشہور عالمِ علم الحیات "ہل آہنز" اور "ٹامسن" کی بھی یہی رائے ہے
پروفیسر ارنیس نے یہ نظریہ اور زیادہ وضاحت و اضافہ کے ساتھ بیان کیا ہے
وہ کہتا ہے "زندگی بھی اسی طرح ازلی ہے جس طرح خود مادہ ازلی ہے۔ زندگی
کے تخم یا جراثیم کواکب سے ہمیشہ جدا ہوتے رہتے ہیں۔ آفتاب کے نور میں یہ خاصیت
موجود ہے کہ وہ ان حقیر جراثیم کو پھیلاتا اور فضا میں بہاتا ہے۔ آفتاب کے نور کی
یہ خاصیت "مسکویل" کے تجربوں سے یقینی طور پر ثابت ہو چکی ہے۔ اس بنا پر فضا
ان جراثیم سے لبریز ہے۔ یہ جراثیم پانی اور ہوا سے محروم ہونے پر بھی زندہ رہتے
ہیں۔ نیز بالائی فضا کی سخت سردی بھی برداشت کر لیتے ہیں۔ علماء کا خیال ہے
کہ وہاں برودت صفر سے ۲۲۰ درجے نیچے ہے۔ یہ جراثیم ہر لمحہ بہت بڑی مقدار
میں آسمانی اجزاء کے ساتھ ایک ستارے سے دوسرے ستارے میں گرتے رہتے
ہیں۔ آفتاب کی قوت دافعہ اس نقل و حرکت میں انھیں مدد دیتی ہے"

لیکن تولیدِ ذاتی کا مذہب بھی اس وقت تک سپر انداز نہیں ہوا ہے۔
"مادرنسٹ بیگل" کے بعد "نیلوگر" نے اس کی از سر نو صدائیں بلند کیں، اس کا نظریہ
بھی "بیگل" کے نظریہ سے مشابہ ہے۔ وہ کہتا ہے "قابلِ حیات مادہ زلالیہ
( ) بلا کسی واسطے کے اس وقت خود بخود موجود ہوگیا
تھا جب زمین کے پانی میں زندگی قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی تھی
اس مادہ کی تکوین 'سیانوجن' (نٹروجن اور کاربون کا مرکب) 'آکسیجن' اور
دوسرے پگھلے ہوئے معدنی مواد کے اتحاد کا نتیجہ تھی۔ جوں ہی ان اشیاء
کا باہم اجتماع ہوا، قابلِ حیات مادہ زلالیہ وجود میں آگیا۔ پھر تدریجی ترقی
کے بعد ادنیٰ جانداروں کی شکل میں تبدیل ہوگیا۔ یہی ابتدائی جاندار جملہ
حیوانات و نباتات کی اصل ہیں" اس عالم کا خیال ہے کہ شروع میں صرف ایک
جاندار نے ظہور کیا تھا۔ پھر اس سے دو جاندار پیدا ہو گئے، یہی دونوں جملہ
ذی روح کائنات کے مورثِ اعلیٰ ہیں۔ ایک سے نبات کا سلسلہ شروع
ہوا، دوسرے سے حیوان کا۔

۱۸۸۰ء میں ایک عالم "پریر" نے تمام علماء سے مختلف مذہب
اختیار کیا۔ وہ کہتا ہے "عالمِ کون میں زندگی قدیم و ازلی ہے۔ زمین پر
زندگی اس وقت بھی موجود تھی جب وہ ایک آتشی کرہ تھی" وہ یہ بھی
تسلیم نہیں کرتا کہ جمادات سے زندگی کا آغاز ہوا۔ اس کا دعویٰ ہے کہ خود
جمادات خود کسی ازلی زندگی سے پیدا ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ قول شاذ اور
کمزور ہے۔ مشاہدے کے بھی خلاف ہے۔ ہر کس و ناکس جانتا ہے کہ زندہ کائنات
ایک خاص درجہ تک ہی حرارت برداشت کر سکتی ہیں، زیادہ سے زیادہ حرارت
برداشت کرنے والے جراثیم کے تخم بھی سنٹی گریڈ کے ۱۲۰ درجہ میں ۳۰ منٹ
سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتے، ایسی حالت میں زندگی کا اس وقت موجود
ہونا، جب یہ کرہ ایک آتشی کرہ تھا، کیونکر تسلیم کیا جا سکتا ہے؟

(وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا)

غرض زندگی کی گتھی باوجود علم کی اس جدوجہد کے اب تک سلجھ نہیں
سکی ہے۔ یہ ایک معمہ ہے جس کا حل عقلِ انسانی کی دسترس سے باہر ہے۔ جس
قدر بھی نظریے قائم کئے گئے ہیں، اول تو وہ نظریہ سے زیادہ نہیں پھر ان میں
بھی اس قدر فکر کا اضطراب اور رائے کا اختلاف ہے کہ "ظلمات بعضہا
فوق بعض" کے مصداق ہیں۔ اب سے تقریباً چودہ سو برس پہلے اس بارے
میں ادعاءِ علم نے نہیں بلکہ زبانِ وحی نے ایک اعلان کیا تھا "یَسْئَلُوْنَکَ
عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ" دنیا آج بھی اس سے زیادہ کچھ
نہیں جانتی اور اسی لئے وَمَا اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا کا
حکم بدستور عقلِ انسانی پر حکمراں ہے!

افسانہ

ساحرہ

ترجمہ
منٹو

رات کی تاریکی چھا رہی تھی۔ کلیسا کا محافظ، سیفلے گیکن اپنی جھونپڑی میں، جو گرجا کے ساتھ ملحق تھی، اپنے لمبے چوڑے بستر پر دراز تھا۔ گو اُسے مرغیوں کی طرح جلد سو جانے کی عادت تھی مگر وہ ابھی بیدار تھا۔ اُس کے سُرخ اور بکھرے ہوئے بال میلے کچیلے لحاف سے باہر نکلے ہوئے تھے اور بھاری غلیظ پاؤں، دوسری طرف سے نظر آ رہے تھے۔ وہ کچھ سننے میں مصروف نظر آتا تھا۔ اُس کی جھونپڑی، اُس دیوار سے ہم کنار تھی، جو کلیسا کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے تھی۔ اُس کے دریچے میدان کی طرف کُھلتے تھے۔ باہر میدان میں ایک ہنگامہ کارزار برپا تھا۔ یہ معلوم کرنا کہ کس کی ہستی صفحۂ گیتی سے نابود کی جا رہی ہے یا کس کی تباہی کے لئے قدرت اِس قدر مضطرب و ہنگامہ آرا ہے، بہت دشوار تھا۔ لیکن پھر بھی پیہم چیخ و پکار سے ظاہر ہوتا تھا کہ کوئی نہ کوئی ضرور گرفتارِ بلا ہے۔ میدان میں کوئی فاتح لشکر پورے جوش و خروش سے اپنی سرگرمی کا مظاہرہ کرتا معلوم ہوتا تھا۔ تُند ہوائیں جنگل اور کلیسا کی چھت سے دست و گریباں ہو رہی تھیں، کھڑکیوں کو اپنے گھونسوں کا تختۂ مشق بنا رہی تھیں اور اپنے مہیب پنجوں سے ہر چیز کے بخیے اُدھیڑنے میں مصروف تھیں۔ اسی محشر خیز فضا میں محصور کسی مفتوح کی رقت، آہ و زاری اور نالہ و بکا کی صدا آ رہی تھی .... چھت، آتش دان یا دریچے میں کوئی غیر مرئی چیز سسکیاں بھر رہی تھی۔ یہ صدا کسی مدد کی طالب معلوم نہ ہوتی تھی بلکہ انتہائی صدمہ کی ایک مایوس کُن چیخ تھی۔ جو اس بات کی مظہر تھی کہ اب وقت گذر چکا ہے اور تلافی کا خیال غلط ہے۔

برفانی تودوں پر یخ کی باریک چادریں بچھی تھیں، اِن پر اور درختوں کے پتوں پر آنسوؤں کے قطرے کھڑکھڑا رہے تھے۔ سڑکوں اور پگڈنڈیوں پر کیچڑ اور برف کا سیلاب کروٹیں لے رہا تھا۔ قصہ مختصر یہ منظر سخت ہولناک تھا، مگر شاید افلاک کی نظروں سے ظلمتِ شب نے اس بلا خیز طوفان کو اوجھل کر رکھا تھا کہ وہ بدستور برف باری میں مشغول تھے۔ ہوا کسی مخمور کی طرح لڑکھڑا رہی تھی، جو برف کے گالوں کو ہر طرف آوارہ و پریشان کر رہی تھی۔

سیفلے نے اِن طوفانی آوازوں کو سنا اور بہت متفکر ہوا۔ دراصل بات یہ تھی کہ وہ یہ جانتا تھا کہ یہ تمام ہنگامہ کس کے دستِ قدرت کا محرک ہے۔ بہرحال اُسے اس بارے میں شبہ ضرور تھا۔ اُس نے لحاف کے اندر غصہ میں اپنی انگلی ہلاتے ہوئے کہا۔ "مجھے معلوم ہے، مجھے اس کی وجہ اچھی طرح معلوم ہے۔" کھڑکی کے پاس محافظ کی بیوی رعنیہ فوفنا، ایک اسٹول پر بیٹھی ہوئی تھی۔ پاس ہی ایک دوسرے اسٹول پر ایک لالٹین پڑی تھی، جس کی مدھم اور لرزاں روشنی اُس کے چوڑے سانولے سڈول جاذبِ نظر جسم کے نقشے اور سیاہ بالوں پر جو دراز ہونے کی وجہ سے فرش کو چوم رہے تھے، رقص کر رہی تھی، وہ موٹے اور کھردرے ٹاٹ کی بوریاں بنانے میں مصروف تھی۔ اُس کے ہاتھ پھرتی سے کام کر رہے تھے، لیکن اُس کے تمام اعضا، آنکھیں، ابرو، ہونٹ اور سپید گردن ساکن تھے۔ ایسا معلوم ہوتا گویا وہ محوِ خواب ہیں۔

کبھی کبھار وہ اپنا سر اوپر اٹھاتی کہ گردن کی تھکان دور کر سکے اور چند لمحوں کے لئے دریچے کی طرف دیکھ کر جس کے باہر طوفان و بادو باراں غضب ڈھا رہا تھا وہ پھر گردن جھکا کر اپنے کام میں مشغول ہو جاتی۔ اس کے خوبصورت چہرے، اُبھری ہوئی ناک اور گالوں کے گڑھوں سے کسی قسم کی مسرت، خواہش یا غم کے آثار ہویدا نہ تھے۔ خوبصورت فوارہ اگر جاری نہ ہو تو کچھ ظاہر نہیں کرتا۔

آخرکار اُس نے ایک بوری کو ختم کر لیا اور اسے ایک طرف پھینک دیا۔ پھر اپنے جسم کو بڑے تکلف سے سیدھا کر کے اُس نے

اپنی غیر متحرک اور بے نور آنکھیں کھڑکی کی طرف گاڑ دیں —— کھڑکی کے شیشے اشک آسا قطروں کے ہمراہ تیرتے معلوم ہوتے تھے اور برف کے اُن گالوں سے سپید ہو رہے تھے جو اُن پر گذرتے، رعنیہ کی طرف نگاہیں اُٹھا کر دیکھتے اور پگھل جاتے . . . . محافظ نے باآواز بلند کہا "بستر پر آجاؤ" مگر رعنیہ خاموش بیٹھی رہی۔ یکایک اُس کی پلکیں کانپنے لگیں اور آنکھوں میں توجہ کی ایک چمک سی پیدا ہوئی۔

سیفلے جو لحاف کے اندر اُس کے چہرے کی نیرنگیوں کا بغور مطالعہ کر رہا تھا بستر سے اپنا سر نکال کر بولا "کیا معاملہ ہے؟"

"کچھ نہیں . . . . میں نے خیال کیا تھا کہ شاید کوئی آرہا ہے" رعنیہ نے جواب دیا۔

یہ سن کر محافظ نے لحاف کو ٹانگوں سے ایک طرف دھکیل دیا اور گھٹنوں کے بل جھک کر اپنی بیوی کی طرف متعجب نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ لیمپ کی روشنی اُس کے ریش دار چہرے اور کھردرے بالوں پر پڑ رہی تھی۔

"سُن رہے ہو کچھ"؟

آندھی کے شور میں محافظ کی ایک مدھم جھنکار کی آواز سنائی دی، جو اُس مچھر کی صدا کے مرادف تھی جو کسی کے گال پر بیٹھنا چاہتا ہو اور ہٹانے پر غصہ میں پورے زور سے بھنبھناتے۔

"غالباً ڈاک جا رہی ہے"، سیفلے نے اپنی ایڑیوں کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔

گرجے سے دو میل کے فاصلے پر وہ سڑک واقع تھی جس پر سے ڈاک گاڑی گذرا کرتی تھی۔ آندھیوں کے موسم میں جب ہوا سڑک سے کلیسا کی طرف رخ بدلا کرتی تھی تو گھنٹی کی آواز جھونپڑی کے مکینوں تک پہنچ جایا کرتی تھی۔

"میرے اللہ! ذرا خیال تو کرو لوگ اس موسم میں بھی گاڑیوں پر سوار پھرتے ہیں" رعنیہ نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"لیکن یہ سرکاری کام ہے۔ اِس میں کسی کی مرضی کو کیا دخل؟"

اُس جھنکار کی مدھم صدا کچھ عرصہ فضا میں معلق رہ کر غائب ہو گئی۔

"اب گاڑی گذر چکی ہے" سیفلے نے لحاف اوڑھتے ہوئے کہا۔ لیکن وہ ابھی اچھی طرح لحاف اوڑھنے بھی نہ پایا تھا کہ اُس نے گھنٹی کی آواز کو صاف طور پر سُنا۔ اُس پر اُس نے اپنی بیوی کی طرف پریشان نگاہوں سے دیکھا بستر سے باہر نکل آیا اور آتش دان کے پاس ٹہلنے لگا۔ گھنٹی کی آواز کچھ دیر تک سنائی دیتی رہی پھر یکایک بند ہو گئی، جیسے وہ پھر کبھی نہ سنائی دے گی۔

"میرے خیال میں اب آواز قطعاً بند ہے" سیفلے نے ٹھہر کر اپنی بیوی پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ لیکن جوں ہی ہوا کا ایک جھونکا کھڑکی کے راستہ اندر داخل ہوا۔ گھنٹی کی ٹن ٹن دوبارہ سنائی دینے لگی۔ سیفلے کا رنگ زرد پڑ گیا۔ گلا صاف کرتے ہوئے وہ دروازے کی طرف ننگے پاؤں لپکا۔

"ڈاکیہ آندھی میں اپنا راستہ کھو بیٹھا ہے" وہ اپنی بیوی کی طرف ملامت آمیز نگاہوں سے دیکھتا ہوا چلایا "سنتی ہو؟ ڈاکیہ راستہ بھول گیا ہے! . . . . مجھے . . . . . . معلوم ہے! کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ میں اِسے بالکل نہیں سمجھ سکتا؟"

پھر وہ گنگناتا ہوا بولا "میں اس حرکت کو بخوبی سمجھتا ہوں۔ —— لعنت ہو تم پر!"

"کیا سمجھتے ہو تم؟" رعنیہ نے اپنی نگاہوں کو کھڑکی سے جُدا کئے بغیر اپنے خاوند سے دریافت کیا۔

"میں جانتا ہوں کہ یہ سب تیری کارستانی ہے —— تیری شیطان کی خالہ —— یہ تیری چالاکی ہے۔ لعنت ہو تم پر! یہ برفباری اور ڈاکیہ کی گمراہی، سب کچھ تیرا ہی کیا ہے . . . . تیرا!"

"تم دیوانے ہو . . . . احمق!" اُس کی بیوی نے آہستہ سے جواب دیا۔

"میں ایک عرصہ سے تیرا مشاہدہ کر رہا ہوں اور اب میں آخری نتیجہ پر پہنچ چکا ہوں . . . . شادی کے پہلے روز ہی میں نے سمجھ لیا تھا کہ تیری رگوں میں کسی کُتی کا خون موجزن ہے"

"اُف" رعنیہ نے شانے ہلاتے ہوئے کہا "بے وقوف خدا سے ڈرو!"

"جادوگرنی ہمیشہ جادوگرنی ہوتی ہے" سیفلے نے آنسوؤں بھری آواز میں اپنی ناک کرتے سے صاف کرتے ہوئے کہا "اگرچہ تم میری بیوی ہو اور پادری خاندان سے تعلق رکھتی ہو لیکن میں پھر بھی کہوں گا کہ تمہیں مذہب سے کوئی نسبت نہیں ہے . . . . خدایا ہم پر

رحم فرمائیو! پچھلے سال پیغمبر دانیال کی برسی پر برفباری ہوئی۔ بتاؤ اُس روز کیا واقعہ پیش آیا تھا؟ — ایک مسٹری پناہ لینے کے لئے ہمارے گھر میں آدھمکا یعنی سینٹ الیکس کے عرس پر برف کا تودہ ٹوٹ گیا اور مقامی تھانے دار ہمارے یہاں نازل ہو گیا اور ساری رات تیرے ساتھ سرگوشیاں کرتا رہا...... ملعون حیوان! جب صبح کو وہ نکلا اور میں نے اُس کی طرف دیکھا تو اُس کی آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے نمودار تھے، گال اندر پچکے ہوئے تھے۔ اگست کے روزوں میں دو آندھیاں آئیں اور اُن کے ساتھ ہی یہاں دو شکاری آن موجود ہوئے۔ یہ سب کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے! لعنت ہو اُن پر! — مگر، اب تم کیکڑے کی طرح سُرخ کیوں ہو رہی ہو؟"

"تمہیں کچھ معلوم نہیں ہے۔"

"کیا معلوم نہیں ہے — تو اس سال کرسمس کے موقعہ پر سردیوں میں جب دن رات آندھی چلتی رہی تھی کیا ہوا تھا؟ — ایک منشی راستہ بھول کر یہاں آ گرا — سگِ ناہنجار! — یہ خیال کرتے ہوئے کہ تمہیں وہ پسند آ گیا! لعین کہیں کا! بیہودہ قد زمین سے ایک فٹ اونچا، چہرے پر پھنسیاں اور گردن مڑی ہوئی! — اگر شکیل ہوتا تو علیحدہ بات تھی — مگر وہ — اُف — وہ شیطان کی طرح بد صورت تھا!"

یہ کہہ کر محافظ نے سانس لیا اور ہونٹوں کو صاف کرتے ہوئے سننے لگا۔ گھنٹی کی صدا سنائی نہ دے رہی تھی۔ لیکن ہوا بدستور چھت کے ساتھ ٹکرا کر شور پیدا کر رہی تھی۔ یکایک تاریکی میں پھر وہی جھنکار نمودار ہوئی۔

"اب دیکھا کچھ ہونے والا ہے!" سیفلے نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "خدا کیے یونہی گمراہ نہیں پھر رہا ہے! میری آنکھیں نکلوا دینا اگر وہ تمہاری تلاش نہ کر رہا ہو۔ آہ شیطان اپنے کام سے اچھے پیسے بنا لیتا ہے اور تمہاری اچھی طرح مدد بھی کر سکتا ہے! وہ پھر پھرا کر یہیں آ جائے گا۔ میں جانتا ہوں — خوب سمجھتا ہوں! تم اُسے چھپا نہیں سکتی ہو — تم شیطان کی خالہ — چالاک کافرہ! جوں ہی آندھی شروع ہوئی، مجھے پتہ لگ گیا کہ تم کس لئے بھاگ رہی ہو۔"

"اب تم میں اور کسی احمق میں کیا فرق ہے؟" بیوی نے مسکراتے ہوئے کہا "کہہ رہے ہو کہ یہ آندھیاں میں لاتی ہوں — دماغ میں بھوسہ بھرا ہے تمہارے!"

"ہوں! — دانت دکھا رہی ہو! — یہ تمہارا کرنا ہو یا نہ ہو، بہرحال میں سمجھتا ہوں کہ جب کبھی تمہارا خون جوش مارتا ہے تو طوفانی موسم یقینی ہے اور جب موسم طوفانی ہو تو پھر نوجوانوں کی آمد یہاں مسلمات میں سے ہوتی ہے۔ جب اسی قسم کے واقعہ کی بدبختی آ پکنے میں تو یقینی امر ہے کہ تم ہی اُن سب کی متحرک ہو!"

اپنی گفتگو زیادہ مؤثر بنانے کی خاطر محافظ نے اپنی انگلی پیشانی پر رکھی، بائیں آنکھ کو بند کر لیا اور ایک ایک لفظ کو ٹھہر ٹھہر کر ادا کرنے لگا "اگر تم واقعی نسلِ انسانی سے تعلق رکھتی ہو اور جادوگرنی نہیں ہو تو تمہیں غور کرنا چاہیئے کہ یہ سب مسٹری، منشی اور شکاری، انسان نہیں تھے بلکہ شیطان اُن کا بھیس بدلے ہوئے تھا — آہ تمہیں اس کے متعلق ضرور غور کرنا چاہیئے!"

"سیفلے تم جاہل ہو" اُس کی بیوی نے اُس کے چہرے کی طرف ہمدردانہ نظریں اُٹھاتے ہوئے کہا "جب ابا زندہ تھے تو ہمارے یہاں ہر قسم کے لوگ ملیریا کے علاج کے لئے آیا کرتے تھے، وہ ہر روز ہی آتے مگر اُس وقت انھیں کسی نے بھی شیطان کے نام سے نہ پکارا۔ مگر مدتوں میں جب کوئی بھولا بھٹکا مسافر طوفانی موسم میں یہاں پناہ لینے کے لئے آ جاتا ہے تو تم اُس کی آمد پر حیرانی ظاہر کرتے ہو اور جاہلوں کی طرح ہر قسم کے شبہات کو اپنے دل و دماغ میں جمع کر لیتے ہو۔"

بیوی کی منطق اور استدلال سیفلے پر اثر انداز ہوئی۔ وہ ننگے پاؤں کھڑا سر جھکائے اس پر غور کرتا رہا۔ دراصل ابھی تک اُسے اپنے شبہات کی صحت پر پورا یقین نہیں تھا۔ بیوی کی معنی خیز گفتگو نے اُس کے شک کو تھوڑی دیر کے لئے بالکل رفع کر دیا۔ مگر فوراً ہی اُسے کچھ خیال آیا اور سر ہلاتا ہوا بولا۔

"مگر یہ کبھی نہیں ہوا کہ بوڑھے، لنگڑے، اپاہج پناہ لینے کے لئے آئے ہوں بلکہ اس کے برعکس ہمیشہ نوجوان ہی یہاں رات کاٹنے کے لئے آدھمکا کرتے ہیں اس کی وجہ کیا ہے؟ — اگر اُن کی آمد اور آرام طلبی ہی تک محدود ہو تو الگ بات ہے مگر وہ تو شرارتیں کیا کرتے ہیں — نہیں، دنیا میں تمہاری صنف سے بڑھ کر چالاک اور ریاکار اور کوئی مخلوق نہیں ہو سکتی! عقلِ سلیم کا مادہ تم میں رتی بھر بھی

نہیں مگر یا کاری اُف اُف اُف، کچھ پوچھو ہی نہیں ——— خدا بچائے پہوڑاکیہ کی گھنٹی کی آواز آرہی ہے۔ آندھی شروع ہونے پر ہی میں تمہارے دل کی بات جان گیا تھا . . . . . . یہ سب تیری فسوں سازی ہے ——— مسکرٹی!

" تم خواہ مخواہ مجھے اپنا تختۂ مشق کیوں بنا رہے ہو؟ بے ایمان کہیں کے!" اُس کی بیوی صبر کھو چکی تھی آخر تم کو لنار کی طرح اس بات پر کیوں جمے ہوئے ہو؟"

" میں اپنی بات پر اس لئے جا ہوا ہوں کہ اگر ——— خدا بچائے . . . . . . اُسی قسم کا واقعہ پھر پیش آگیا ——— سنتی ہو؟ اگر آج رات پھر کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو میں صبح اُٹھتے ہی سیدھا فادر بکوڈم کے پاس جاؤں گا، اور ساری رام کہانی کہہ سناؤں گا۔ میں صاف الفاظ میں کہہ دوں گا " گستاخی معاف، مگر بیوی ضرور جادوگرنی ہے" وہ پوچھے گا " کیسے "؟ اُسے بتا دوں گا، " مگر لعنت ہو تم پر اے عورت! روزِ محشر ہی کو نہیں بلکہ تم اسی زندگی میں ہی اپنے کئے کی سزا بھگت لوگی! میں یوں ہی نہیں کہہ رہا تمہاری نوعیت کے لوگوں کے لئے مقدس کتاب میں ایسے لفظ موجود ہیں!"

یکایک کھڑکی پر ایسی غیر طبعی اور غیر معمولی دستک ہوئی کہ بیٹے کا رنگ زرد پڑ گیا اور قریب تھا کہ خوف کے مارے پیچھے زمین پر گر پڑے۔ اُس کی بیوی بھی سخت خوفزدہ ہو گئی۔

" ازراہِ خدا، ہمیں اندر آنے دیجئے، ہم باہر سردی سے ٹھٹھر رہے ہیں" محافظ اور اُس کی بیوی نے ایک لرزاں اور بھدی آواز کو یہ کہتے سُنا۔ "یہاں کون صاحب رہتے ہیں؟ خدا کے لئے رحم فرما کر ہمیں اپنے ہاں پناہ دیجئے، ہم راستہ بھول گئے ہیں۔"

" تم کون ہو؟ رعشیہ نے دریافت کیا۔ وہ کھڑکی کے باہر جھانکنے سے ڈرتی تھی۔

" ڈاکئے " دوسری آواز نے کہا۔

" تم اپنے شیطانی ارادے میں کامیاب ہوگئی ہو " بیٹے نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا " غلطی کا کوئی امکان نہیں، میں بجا کہہ رہا ہوں ——— خیر اب دروازہ کھول دو "

یہ کہہ کر محافظ دوچلا نگوں میں اپنی چارپائی پر پہنچ گر بردوں والی چٹائی پر بیٹ گیا اور دیوار کی طرف منہ کر کے بڑبڑانے لگا۔ فوراً ہی اُس نے اپنی پشت پر سرد ہوا کا جھونکا محسوس کیا۔ دروازہ کھلا اور ساتھ ہی ایک لمبا تڑنگا جوان، برف سے لت پت، دہلیز پر نمودار ہوا۔ اُس کے پیچھے ایک اور آدمی اُسی شکل کا دکھائی دے رہا تھا۔

" تھیلے بھی اندر لے آؤں؟" دوسرے آدمی نے بھدی آواز میں اپنے ساتھی سے کہا۔

" تم انہیں باہر کیوں کر چھوڑ سکتے ہو؟" یہ کہتے ہوئے پہلے آدمی نے اپنی برساتی کو اتارنا شروع کیا۔ مگر فوراً ہی یہ عمل ترک کر کے اُسے اپنی ٹوپی سمیت کھینچ کر انگیٹھی کے پاس پھینک دیا۔ پھر اپنا بڑا کوٹ اتار کر ایک طرف رکھنے کے بعد علیک سلیک کئے بغیر جھونپڑی میں اِدھر اُدھر ٹہلنا شروع کر دیا۔

یہ ڈاکیہ ایک خوبرو نوجوان تھا۔ ایک بھدی سی وردی اور بڑے بڑے بوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اِدھر اُدھر ٹہلنے سے جب اُس کے سرد جسم میں حرارت عود کر آئی تو وہ ایک میز کے قریب پہنچ گیا۔ کیچڑ آلود پاؤں بوریوں پر پھیلا دیئے اور ٹھوڑی کو ہاتھ سے سہارا دے کر خاموش سوچنے لگا۔ اُس کا چہرہ بعض جگہوں پر سردی کی وجہ سے سُرخ ہوگیا تھا۔ اِس کے علاوہ اُس طوفان کی کوفت کے آثار بھی اُس کے چہرے پر نمایاں تھے جس سے وہ ابھی ابھی رہائی حاصل کر کے آیا تھا، گو غم و غصّے نے اُس کی حالت میں ایک تغیر پیدا کر رکھا تھا مگر وہ اُس پگھلی ہوئی برف کے باوجود جو اس کے ابروؤں، مونچھوں اور ڈاڑھی پر جم رہی تھی، وہ خوش شکل معلوم ہو رہا تھا۔

" یہ بھی کتوں ایسی زندگی ہے" ڈاکئے نے اس انداز سے دیواروں پر نظریں گھماتے ہوئے کہا جیسے وہ یقین نہیں کر رہا ہے کہ وہ کسی گرم جگہ میں محفوظ ہے " اگر آپ کی روشنی دکھائی نہ دیتی تو ہماری تباہی یقینی تھی! خدا ہی جانتا ہے یہ طوفان کب تھمے گا! اس ذلیل زندگی کا کوئی انجام نہیں، ہم اس وقت کس جگہ موجود ہیں؟" اُس نے محافظ کی بیوی سے مخاطب ہو کر دریافت کیا۔

" گلولیسکی پہاڑی پر ——— جنرل کالی نوکلی کی جاگیر کے پاس" رعشیہ نے چونک کر شرماتے ہوئے جواب دیا۔

" سن رہے ہو سٹی پین؟ ڈاکئے نے مڑ کر اپنے ساتھی کوچوان کو کہا جو ابھی تک اپنے کاندھے پر ڈاک کے تھیلے اُٹھاتے دروازے میں کھڑا تھا۔ ہم لوگ گلولیسکی پہاڑی پر پہنچ چکے ہیں، ان الفاظ

کو کو جوان نے ایک بصدی آہ نما آواز میں کہا اور ساتھ ہی باہر جا کر ایک اور تھیلا اٹھا لایا، ایک بار پھر باہر گیا اور ڈاکئے کی تلوار اور پیٹی اٹھا لایا۔

ان چیزوں کو احتیاط سے دیوار کے ساتھ رکھ کر وہ باہر والے کمرے میں چلا گیا اور وہاں بیٹھ کر سگریٹ پینا شروع کر دیا۔

"شاید آپ اس سفر کے بعد تھوڑی سی چائے پینا پسند فرمائیں گے؟" رعشیہ نے ڈاکئے سے کہا۔

"ہم یہاں چائے پینے کے لئے کیوں کر ٹھہر سکتے ہیں؟" ڈاکئے نے تیوری چڑھاتے ہوئے جواب دیا "ہمیں جلدی کرنی چاہیئے، تھوڑی دیر آگ تاپنے کے بعد ہمیں جلد روانہ ہو جانا چاہیئے، ورنہ اندیشہ ہے کہ ہم ڈاک گاڑی کو کھو بیٹھیں گے۔ دس منٹ اور ستانے کے بعد ہم یہاں سے اپنی راہ لیں گے، آپ ہمیں راستہ دکھا دیجئے گا یہی آپ کی عنایت ہوگی۔"

"یہ موسم بھی ایک عذاب ہے۔" رعشیہ نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"ہوں ——— جی ہاں ...... مگر کیا دریافت کر سکتا ہوں کہ آپ کون ہیں؟"

"ہم یہاں گرجے کے ساتھ رہتے ہیں۔ پادری خاندان سے تعلق رکھتے ہیں ...... وہ میرا خاوند ہے، جو سو رہا ہے ——— سیفلے اٹھو۔ مہمانوں کی خیر و عافیت دریافت کرو! ——— آج سے اٹھارہ مہینے پہلے یہ گرجا ہوا کرتا تھا، بے شک جب یہاں شرفا سکونت پذیر تھے، تو عبادت کے لئے بہت سے لوگ جمع ہو جایا کرتے تھے مگر اب کہ شرفا۔ قریب قریب یہ جگہ چھوڑ چکے ہیں، میرا یہ کہنا غالباً فضول ہوگا کہ پادری کا ذریعہ معاش بالکل محدود ہو چکا ہے ——— سیفلے ریٹائر ہونے کے قریب ہے، ان دنوں وہ گرجے کی رکھوالی پر نوکر ہے۔"

"اس کے بعد ڈاکئے کو فوراً ہی یہ بھی بتایا گیا کہ سیفلے جنرل کی بیوی کے پاس جاتے اور لاٹ پادری کے نام ایک سفارشی چٹھی کی درخواست کرے تو ایک اچھی نوکری مل جانا یقینی ہے۔ لیکن سیفلے جنرل کی بیوی کے پاس جاتا ہی نہیں۔ وہ سخت کاہل ہے اور لوگوں سے ڈرتا ہے، بہر کیف ہم گرجے سے منسلک ہیں" رعشیہ نے اپنی گفتگو میں ان الفاظ کا اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کا گذر کیسے ہوتا ہے؟" ڈاکئے نے دریافت کیا۔

"اس کلیسے کے ساتھ ایک باغ اور مرغزار ملحق ہے ——— مگر ہم اس زمین سے کچھ زیادہ حاصل نہیں۔" رعشیہ نے سرد آہ بھری "بوڑھا فادر نکوڈم، سینٹ نکولس کی برسیاں منانے کی خاطر سال میں دو دفعہ یہاں آ دھمکتا ہے اور تمام فصل اپنے ہمراہ لے جاتا ہے، اس صورت میں ہمارے لئے کچھ خاک باقی رہتا ہے؟"

"تم جھوٹ بول رہی ہو" سیفلے نے لیٹے لیٹے بلند آواز میں کہا "فادر نکوڈم خدا رسیدہ بزرگ ہیں۔ اگر وہ ایسا کرتے بھی ہیں تو یہ اُن کا حق ہے۔"

"تم میاں بیوی آپس میں ناراض معلوم ہوتے ہو" ڈاکئے نے رعشیہ سے دریافت کیا "تمہاری شادی کو بھلا کتنا عرصہ گذر چکا ہے؟"

"پچھلی اتوار کو پورے تین سال گذر چکے ہیں ——— میرا باپ اس گرجے کا محافظ ہوا کرتا تھا جب اُس کے مرنے کا وقت قریب آیا تو اُس نے گرجے کے متعلقین کو کہلا بھیجا کہ وہ اپنے یہاں سے کوئی کنوارا آدمی بھیج دیں تاکہ اُس کی وفات کے بعد وہ شخص میرے خاوند کی حیثیت سے اُس کی جگہ پر قابض رہے ——— یہ ہے ہماری شادی کا قصہ"

"یعنی ایک پنتھ اور دو کاج" ڈاکئے نے سیفلے کی پشت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "بیوی بھی مل گئی اور ملازمت بھی۔"

یہ سُن کر سیفلے اپنی ٹانگوں کو جنبش دے کر دیوار کے اور زیادہ قریب ہو گیا۔ اسی اثنا میں ڈاکیہ میز سے اُٹھ کر ڈاک کے تھیلے پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے دونوں تھیلوں کو آپس میں ملا دیا اور تلوار کو ایک طرف رکھنے کے بعد فرش پر پاؤں لٹکائے اُن پر لیٹ گیا۔

(باقی آئندہ)

وہ جس نے بدی لوٹی تھی!

امریکہ کا ایک سچّا واقعہ

ادارہ

میکی سوان بہت بڑا مجرم تھا، چوروں کا سردار تھا، اس کا خاص پیشہ یہ تھا کہ خفیہ طور پر امریکہ میں شراب داخل کرتا، اور اس کام سے کروڑوں روپیہ کما لیتا تھا۔

میکی، بلند قد اور کشادہ سینہ کا آدمی تھا۔ وہ اپنے آدمیوں سے کام تو بڑی سختی سے لیتا تھا۔ مگر اُن پر مہربان بھی بہت رہتا تھا۔ نہایت فیاضی سے انھیں انعام دیا کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس کے گرد جاں نثاروں کی ایک جماعت ہو گئی تھی، جو اُس کے پسینہ کی جگہ اپنا خون بہانے پر ہر وقت تیار رہتی تھی۔ مگر میکی کو گوارا نہ تھا کہ وہ بدمعاشوں کا سردار کہلائے۔ اسی لئے اس نے ایک ہوٹل کھول رکھا تھا، تاکہ اپنی اصلیت پر پردہ ڈالے رکھے۔

میکی کے پاس بے حساب دولت جمع ہو گئی تھی، مگر اس کی طمع بڑھتی ہی جاتی تھی، حالانکہ ایک بیوی اور ایک دو برس کی لڑکی کے سوا اس کا کوئی رشتہ دار موجود نہ تھا۔

دفعتاً ایک واقعہ پیش آیا جس سے مجبور ہو کر میکی اپنی حالت پر سنجیدگی سے غور کرنے لگا۔

× × × ×

میکی کی بیوی کا انتقال ہو گیا، یہ عورت بڑی ہی شریف نیک سیرت اور خدا ترس تھی، حالانکہ اپنے شوہر کے جرائم سے بخوبی واقف تھی۔

مرتے وقت عورت نے اپنے شوہر کو بلایا اور آبدیدہ ہو کر کہنے لگی:

"میکی! اس وقت مجھے بڑی فکر مارتی کی ہے میں نہیں چاہتی کہ ہماری یہ لڑکی بڑی ہو کر جانے کہ اس کا باپ مجرموں کا سرغنہ ہے، میں نہ تمہیں شرمندہ کرنا چاہتی ہوں، نہ تمہاری بے عزتی ہی کا دل میں خیال ہے، لیکن اس وقت میں سچ بولنے سے باز نہیں رہ سکتی۔ چند سال بعد مارتی مجھے بالکل بھول جائے گی۔ صرف تم ہی اس کی آنکھوں کے سامنے ہو گے۔ اگر تم اپنی اصلاح کر لو تو مارتی کو کچھ خبر نہ ہو گی اور وہ نیکی پر چلے گی۔ خدارا اپنی لڑکی کو برباد نہ ہونے دینا۔ بس یہی میری آخری التجا ہے۔ اگر منظور کر لو گے تو میں خوش خوش دنیا سے رخصت ہوں گی!"

میکی یہ سُن کر رونے لگا اور اُس نے اپنی بیوی سے وعدہ کیا کہ جرائم سے تائب ہوتا ہے، آئندہ کبھی بدی میں نہیں جائے گا۔ اُس کی بیوی کی روح اس حال میں پرواز کر گئی کہ ہونٹوں پر تبسم تھا۔

× × × ×

میکی چند مہینے تو اپنے وعدے پر قائم رہا۔ پھر طمع نے اسے مغلوب کر لیا اور وہ اپنے پرانے پیشے کی طرف لوٹ گیا۔ پہلے سے بھی زیادہ زور شور سے، لیکن جب وعدہ یاد آ جاتا تو اس کا دل بے قرار ہو جاتا تھا۔

آخر کار اُس نے طے کیا کہ اپنی لڑکی، مارتی کو اس سب سے زیادہ ترقی یافتہ مدرسہ میں داخل کرائے، جس میں صرف اونچے خاندان ہی کی لڑکیاں پڑھائی جاتی ہیں۔ مارتی اونچے خاندان کی نہیں تھی۔ مگر اُس کے باپ نے اپنی دولت کے زور سے مقصد حاصل کر لیا، اور مارتی مدرسہ میں قبول کر لی گئی۔

× × × ×

سالہا سال گذرتے چلے گئے۔ اِدھر میکی کی دولت بڑھتی چلی گئی اُدھر مارتی کا بچپن، جوانی میں بدل گیا اب وہ لڑکیوں کے کپڑے نہیں پہنتی تھی، بلکہ جوان عورتوں کے لباس میں ملبوس رہتی تھی۔

میکی نے مارتی کو مدتوں سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ مارتی اب بھی ناسمجھ لڑکی ہی ہے لیکن ایک دن مارتی کا اس کے پاس خط پہنچا، جس میں اُس نے ایک اچھے نوجوان کا ذکر کیا تھا، جو مدرسہ کے قریب ہی رہتا تھا۔

اس خط نے بیکی کو ایک دفعہ پھر غفلت سے جگا دیا۔ اُسے بیوی سے اپنا وعدہ یاد آگیا اور اپنی حالت پر غور کرنے لگا۔

* * * * *

بیکی نے مارتی کو مدرسہ سے ہٹا لیا اور جزیرہ "لانگ" میں اُس کے قیام کا ایک شاندار مکان میں بندوبست کر دیا۔ جہاں وہ اُس سے ملنے آتا رہتا تھا اور اُسے دیکھ کر بہت خوش ہوا کرتا تھا۔

کئی مہینے ہو گئے، بیکی کو یقین ہو گیا کہ مارتی اُس نوجوان کو بھول چکی ہے جس کا ذکر اس نے اپنے خط میں کیا تھا۔ لیکن ایک رات جبکہ مارتی اپنے باپ کے قریب بیٹھی تھی، اس طرح کہنے لگی،

"ابا! میں ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔ امید ہے کہ آپ ناراض نہیں ہوں گے...... کرسمس کے دن جب میں غریبوں کے محلے میں گئی تو ایک شخص مارٹن سے ملاقات ہو گئی۔ بے شک آپ اُسے نہیں جانتے کیونکہ وہ قمار باز ہے۔ اپنے دوستوں میں وہ "بوک مارٹن" کے نام سے مشہور ہے اور میں ...."

مارتی اپنا قصہ سُنا رہی تھی اور بیکی کا سینہ غیظ و غضب سے پھٹا جا رہا تھا کہ سب کو چھوڑ کر مارتی اس شخص پر کیسے عاشق ہو گئی؟

مارتی نے کہا،

"........ اس کے بعد کئی ملاقاتیں ہوئیں ...... وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اسی غرض سے وہ آپ کے پاس آئے گا۔ خدارا اس کی درخواست رد نہ کیجئے گا!"

بیکی اپنی لڑکی کو کچھ صاف جواب نہ دے سکا، یوں ہی کچھ بے معنی بڑبڑایا اور اپنے گھر چلا گیا۔

* * * *

دوسرے دن صبح کو بیکی نے ٹیلی فون پر اپنے ایک ماتحت ساتھی سے دیر تک گفتگو کی جس کا آخری جملہ یہ تھا،

"وہ ہر رات "ایرونگ" کی طرف جاتا ہے۔ دس بجے کے قریب اُسے شکار کر ڈالو۔ خبردار، بچنے نہ پائے۔ اس مہم کو پورا کئے بغیر مجھ سے فون پر کوئی بات نہ کرنا۔ ٹھیک دس بجے میں فون پر تمہارا منتظر رہوں گا!"

بیکی دن بھر اپنے کمرے میں بند رہا۔ سخت بیقرار تھا۔ اُسے اپنی بیوی سے عہد شکنی یاد آئی۔ پھر خیال آیا کہ بیٹی کو کیسے دُلار سے پالا ہے اور اُس سے کتنی محبت کرتا ہے۔ اگر وہ ایک دغاباز چور کے چنگل میں پھنس گئی ہے جسے خود چور بھی اُس کی غداریوں اور بیوفائیوں کی بنا پر حقیر سمجھتے ہیں۔

اُس نے خیال کیا کہ میں نے آج جو فیصلہ کیا ہے، بالکل ٹھیک ہے۔ بوک مارٹن قتل کر ڈالا جائے گا" اور مارتی چند روز میں اُسے بھول جائے گی اور اس کی زندگی تباہ ہونے سے بچ جائے گی۔

ٹھیک گیارہ بجے رات کو فون کی گھنٹی بجی اور بیکی کو خبر دی گئی کہ بوک مارٹن قتل کر ڈالا گیا۔

* * * * *

ایک گھنٹے کے بعد بیکی ریلوے اسٹیشن پر تھا۔ اس نے رات میں نکلنے والے کئی اخبار خریدے تھے۔ جب ریل میں بیٹھ چکا تو ایک اخبار کھولا تو اس میں آخری خبر کی سرخی سے یہ عبارت نظر آئی:

"مشہور چور "بوک مارٹن" پر دس بجے رات سے کچھ پہلے قاتلانہ حملہ کیا گیا۔ یہ حملہ بند موٹر سے کیا گیا تھا۔ لیکن مارٹن کے زخم گہرے نہیں ہیں۔ البتہ اُس کے ساتھ کی عورت قتل ہو گئی ہے۔ جس کا نام "مارتی" معلوم ہوا ہے!"

بیکی اپنی لڑکی کے مرنے کی خبر دیکھتے ہی بیہوش ہو گیا۔

کیا اُس کے دل پہ گذری جو کرتا ہے آرزو
یارب یہ آرزو ہے کہ اب آرزو نہ ہو

عارف

دل دل لوگ کہا کرتے ہیں، تم نے جانا کیا ہے دل
صورت میں تو قطرہ خون ہے، معنی میں دریا ہے دل

میر

عشق سے پیری میں بھی کچھ لاگ باقی رہ گئی
کاروانِ عشق گذرا آگ باقی رہ گئی

امیر

میں اپنے ہوش میں لے نشتہ گر نہیں نہ سہی
تری خبر تو ہے اپنی خبر نہیں نہ سہی

حفیظ جونپوری

اُٹھ نہیں سکتے قدم منزلِ جاناں کے خلاف
اور اگر ہوش کی پوچھو تو مجھے ہوش نہیں

جگر

وہ اگر یاد کریں ہم کو تو بھولیں کس کو
ہم اگر اُن کو بھلائیں تو کسے یاد کریں

حسن بریلوی

KEEPING BALANCE DURING PREGNANCY

• حاملہ کو یہ نہ بھولنا چاہئے۔ کہ اُسے دو
زندگیوں کی پرورش کرنی ہوتی ہے۔ اس لئے
اس کی خوراک غذائیت سے پُر ہونی چاہئے۔
آجکل ناکافی غذائیت کی خرابی عام ہے
سنکارا اس خرابی کو دُور کرتا ہے اور دورانِ
حمل میں خوراک کی کمی کو پورا کرنے کے علاوہ
جسم کو توانا اور صحت مند رکھتا ہے۔
"سنکارا" ہر موسم میں استعمال
کیا جاسکتا ہے۔

سنکارا

تمام خاندان کیلئے ایک ٹانک

قیمت بڑی بوتل ۷ روپے۔ ادھا ۳ روپے ۱۲ر

•

ہمدرد دواخانہ (وقف)، دہلی۔

Hamdard
DAWAKHANA (TRUST) DELHI